تالیف

شیخ طریقت، شریف العلما حضرت علامہ شاہ

محمد ایوب شریف القادری قدس سرہ

(ولادت: ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء-وفات: ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء)

بانی جامعہ رضویہ شمس العلوم پپرا اکنک، کشی نگر

ناشر

مجلس ایوبی، پپرا اکنک، کشی نگر، یوپی

تالیف

شیخ طریقت، شریف العلما حضرت علامہ شاہ

محمد ایوب شریف القادری قدس سرہ

(ولادت: ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳–وفات: ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء)

بانی جامعہ رضویہ شمس العلوم پیر اکنک، کشی نگر

★ نام کتاب : **تفسیرِ ایّوبی**

★ مولف : حضرت علامہ صوفی **محمد ایوب شریف القادری** علیہ الرحمۃ

★ تصحیح : حضرت مولانا **محمد نظام الدین** قادری

: دار العلوم علیمیہ جمداشاہی

★ تخریج : حضرت مولانا **کمال احمد علیمی** نظامی

: و طلبہ دار العلوم علیمیہ جمداشاہی

★ حسب فرمائش: شاہ **محمد سبطین رضا قادری ایوبی**

: صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ ایوبیہ، پپراکنک

★ سنہ طباعت: ۱۴۴۲ھ/۲۰۲۱ء

★ صفحات : ۱۴۴

★ قیمت :

★ طابع و ناشر: مجلس ایوبی، پپراکنک، کشی نگر، یوپی، ۲۷۴۴۰۱

ایصالِ ثواب

مرحوم **اجمیر** بن عبد الغفار و مرحومہ **عالیہ** زوجہ اجمیر

منجانب: جناب **شاکر علی قادری** صاحب

پلاٹ نمبر ۲، سی لائن، روم نمبر ۵، شیواجی نگر، گوونڈی، ممبئی ۴۳

مشمولات

سورۂ فاتحہ

سورۂ بقرہ

☆☆☆☆☆

پیشِ لفظ

حضرت مولانا کمال احمد علیمی

خلیفۂ حضور مفتی اعظم ہند، شیدائے اعلیٰ حضرت، شریف العلما، حضرت علامہ صوفی محمد ایوب شریف القادری علیہ الرحمہ کو اللہ جل شانہ نے گوناگوں اوصاف وکمالات کا حامل بنایا تھا، روحانیت کے ساتھ علمیت میں بھی آپ کی حیثیت مسلم ہے، دعوت وارشاد کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی آپ کو خصوصی شغف تھا، کئی کتابیں یادگار ہیں، ماضی قریب میں حضرت کی کئی ایک علمی وتحقیقی کتابیں شائع ہوکر مقبول انام ہوچکی ہیں۔

زیر نظر کتاب شریف العلما کے قلمی باقیات میں سے ایک بہترین یادگار ہے، اس میں حضرت نے چند منتخب آیات کی تفسیر قلم بند فرمائی ہے، یہ تفسیر، تفسیر نعیمی سے ماخوذ ہیں، اس کتاب سے شریف العلما کے تفسیری ذوق اور علوم قرآن سے غیر معمولی شغف کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

لاجواب تلخیص اور حسن انتخاب لائق دید ہے، لغوی تشریح، تفسیری فوائد، صوفیانہ تفسیر اور اصول تفسیر کی رعایت کے ساتھ مختصر مگر جامع تفسیر اس کتاب کی امتیازی خصوصیات میں سے ہیں۔

یہ کتاب ایک کاپی میں شریف العلما کی دستی تحریر میں شہزادہ شریف العلما، حضرت حافظ وقاری شاہ سبطین رضا قادری ایوبی، سجادہ نشین خانقاہِ عالیہ قادریہ ایوبیہ پپراکنک کشی نگر کے پاس محفوظ تھی، مرکز مجلس ایوبی پپراکنک کے ذمہ داران نے اس کتاب کی اشاعت کا

فیصلہ کیا، استاذ گرامی وقار حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین قادری مصباحی نے تصحیح فرما کر اس کتاب کی اہمیت وافادیت کو دوبالا کر دیا، کچھ محب مکرم حضرت مولانا مفتی رضاء المصطفیٰ برکاتی پڈرونہ نے کیا، اخیر میں راقم الحروف نے طلبہ علیمیہ جمداشاہی کے تعاون سے اس کتاب کی تخریج کرنے کا شرف حاصل کیا، محب گرامی حضرت مولانا غلام سید علی علیمی نے اپنی تکنیکی مہارت سے اس کتاب کی سیٹنگ فرمائی، اب یہ کتاب قارئین کے ہاتھوں میں ہے، امید کہ یہ کتاب بھی مقبول ومتداول ہوگی۔

اس موقع پر ہدیہ تشکر پیش ہے ان تمام حضرات کی خدمت میں جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سے اس کتاب کی تیاری میں تعاون کیا، خصوصاً طلبہ علیمیہ جمداشاہی کا شکریہ جن کی مدد سے اس کتاب کی تخریج مکمل ہوئی، اور سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق حضرت حافظ محمد سبطین رضا قادری ایوبی صاحب ہیں جن کی خصوصی دل چسپی اور تعاون سے اس کتاب کی اشاعت ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مقبول ومفید بنائے۔

کمال احمد علیمی نظامی
دارالعلوم علیمیہ جمداشاہی، بستی

ہدیۂ تشکر

شیخِ طریقت، شریف العلما حضرت علامہ شاہ صوفی محمد ایوب شریف القادری قدس سرہٗ (بانی جامعہ رضویہ شمس العلوم بپرا اکنک ۔ ولادت: ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء –وفات ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) کی ذات بابرکات محتاج تعارف نہیں، آپ کی پوری زندگی دعوت و تبلیغ، رشد وہدایت اور تحقیق و تصنیف سے معمور ہے، آپ کے علمی، تحقیقی، تصنیفی اور تحریری کارناموں کو منظرِ عام پر لانا وقت کا تقاضا تھا، اور دوسروں تک پہنچانا بھی ضروری تھا۔ جس کے لیے مستقل ایک ادارہ اور علمی، تحقیقی کاموں میں مستغرق رہنے والی شخصیات پر مشتمل ایک جماعت کی ضرورت تھی اور ساتھ ہی ساتھ طباعت و اشاعت کے لیے کثیر رقم کا ہونا بھی ضروری تھا۔

رب العلمین نے آقا و مولا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے طفیل ایسے افراد و اسباب مہیا فرمادیے کہ جن کے ذریعہ یہ مشکل کام آسان سے آسان تر ہو گیا۔

۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء میں خانقاہِ قادریہ ایوبیہ (رضانگر بپرا اکنک، کشی نگر، یو۔پی) کا تحقیقی و تصنیفی ادارہ "مجلس ایوبی" وجود میں آیا جو ایوبیہ ایجوکیشنل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے زیرِ اہتمام اب بھی چل رہا ہے۔ جس کی پہلی نشست ۲۶/شوال المکرم ۱۴۳۵ھ ۲۲/اگست ۲۰۱۴ء قبلِ جمعہ خانقاہِ قادریہ ایوبیہ بپرا اکنک، کشی نگر میں منعقد ہوئی، جس میں شیخِ طریقت، شریف العلما حضرت علامہ شاہ صوفی محمد ایوب شریف القادری قدس سرہٗ (م: ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء- ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) کی تحریری دستاویزات پر غور و فکر کیا گیا اور حضرت شریف العلما قدس سرہٗ کی تفسیری تحریریں حضرت مولانا محمد نظام الدین قادری استاذ و مفتی دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی یو۔پی کے

سپرد کی گئیں ،جن کی حضرت نے اپنے قیمتی اوقات سے کچھ وقت نکال کر اصلاح فرمائی، تخریج کا کام حضرت مولانا کمال احمد علیمی نظامی جامعہ علیمیہ جمدا شاہی بستی نے کیا۔

۱۴۳۵ھ ۲۰۱۴ء میں ”تفسیر ایوّبی“ پر کام شروع ہوا تھا، لیکن ہماری سست روی کے سبب وقت پر یہ کتاب نہیں آسکی۔ جب کہ لاک ڈاؤن اس سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوا کہ جو کتابیں سالوں سے پڑی تھیں (”تفسیر ایوّبی“ اور ”حیاتِ شریف العلما“ کا دوسرا اور تیسرا حصّہ) وہ مکمل ہوگئیں اور سالنامہ مجلہ ”یادگارِ ایوبی“ کا خصوصی شمارہ ”انوارِ قرآن“ (سالانہ سیمینار کا مجموعہ مقالات) بھی تیار ہوگیا۔

میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس طرح کے علمی کام سرانجام دیے اور میرے ابا حضور کی تحریری خدمات کو منظر عام پر لانے میں میری مدد فرمائی۔

دعا ہے کہ مالکِ حقیقی اپنی شان رحیمی و کریمی کے طفیل اور امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے صدقے ان مخلصانہ خدمات پر محققین و معاونین کو اجرِ جزیل عطا فرمائے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین صلی اللہ تعالی علیہ وسلم

آپ کا اپنا

شاہ محمد سبطین رضا قادری ایوبی

۱۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۲ھ/۲۹/جنوری ۲۰۲۱ء

بروز جمعۃ، دن بارہ بج کر چار منٹ

مقیم حال۔ خانقاہِ قادریہ ایوبیہ، لوٹس کالونی

درگاہ سیواسنگھ، شیواجی نگر، گونڈی، ممبئی ۴۳

حیاتِ شریف العلما ایک نظر میں

اسمِ گرامی: محمد ایوب شریف القادری۔

القاب : شیخِ طریقت، شریف العلما،

تاریخِ پیدائش ووصال: (۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء - ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء)

مقامِ پیدائش: پپراکنک، دھسواں، کشی نگر، یوپی، انڈیا (سابق ضلع گورکھ پور و دیوریا)

سلسلۂ نسب: محمد ایوب شریف القادری بن محبوب علی بن کتاب علی بن عنایت علی بن خدا بخش علیہم الرحمۃ والرضوان

برادرانِ گرامی: (۱) مولانا غلام غوث مصطفوی خلیفۂ حضور مفتیِ اعظم ہند علیہما الرحمہ

(۲) جناب عبدالنبی برکاتی۔

(۳) جناب مولانا اسد القادری مضطر صدیقی۔

عقدِ نکاح: ۱۹۷۶ء میں جناب یعقوب علی مرحوم کی دخترِ نیک اختر سے ہوا۔

اولادِ امجاد: (۱) مولانا محمد کونین رضا قادری ایوبی۔

(۲) جناب محمد ثقلین رضا قادری ایوبی۔

(۳) انجینئر حسنین رضا قادری ایوبی۔

(۴) شاہ محمد سبطین رضا قادری ایوبی،

سجادہ نشین: خانقاہِ قادریہ ایوبیہ، پپراکنک، کشی نگر۔

مادرانِ علم وہنر: • مکتب اسلامیہ پپراکنک، کشی نگر۔
• دارالعلوم منظرِ اسلام بریلی شریف۔
• جامعہ غوثیہ رضویہ، سکھر، پاکستان۔
• پاکستان منطق کالج، کراچی، پاکستان (تخصص فی المنطق)

فراغت : • ۱۰ ر رجب المرجب ۱۳۹۵ھ۔

علمی لیاقت: مولانا، عالم، فاضل، فاضل معقولات۔

بیعت : حضرت علامہ سید شمس الدین غازی پوری علیہ الرحمۃ، دل دار پور، رکسہاں، ضلع غازی پور کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے۔

خلافت : (۱) حضرت علامہ سید شمس الدین غازی پوری علیہ الرحمۃ، دل دار پور، رکسہاں، غازی پور۔
(۲) شہزادۂ اعلیٰ حضرت، حضور مفتیِ اعظمِ ہند علامہ مصطفیٰ رضا خان علیہ الرحمہ
(۳) مولانا معین الدین القادری لائل پور، پاکستان۔
(۴) حضرت صوفی نبی بخش علیہ الرحمہ، بنگلہ دیش
(۵) مولانا شاہ عبدالغفار صاحب تیغی، کوملہ، بنگلہ دیش۔

زیارتِ حرمین شریفین: • بہ قصدِ حج وزیارت ۱۹۸۳ء۔
• بہ قصد عمرہ وزیارت بغداد، بابل، کوفہ، بصرہ، نجف اور کربلائے معلیٰ ۱۹۹۰ء
• بہ قصدِ عمرہ وزیارتِ حرمین شریفین۔ ۱۹۹۵ء، ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۸ء ۲۰۰۱ء

- یاسر عرفات سے ملاقات (سابق صدر فلسطین) ۱۹۹۰ء

اساتذہ کرام:
- حافظ رجب علی صاحب، بوداٹولہ پپراکنک، کشی نگر۔
- صوفی محمد شریف شمسی تبلیغی صاحب قبلہ۔ (بانی جامعہ تبلیغیہ شمسیہ، بڑہریا، سیوان، بہار)
- حکیم الامت حضرت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
- حضرت علامہ مفتی سید محمد افضل حسین مونگیری علیہ الرحمہ

اعزاز : صوفی ایوارڈ بموقع صوفی کانفرنس، حیدرآباد۔ ۱۹۹۷ء

دینی و علمی خدمات:
- جامعہ رضویہ شمس العلوم کا قیام ۱۹۸۲ء
- تحریکِ جماعتِ اہلِ سنت کا قیام ۱۹۹۵ء
- تبلیغی جماعت کا حقیقی روپ کی تصنیف ۱۹۹۶ء
- جامعہ رضویہ شمس العلوم نسواں کا قیام ۱۹۹۸ء

تصانیف: کم و بیش نصف درجن کتابیں تصنیف فرمائیں۔

وصال : ۳؍ جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۱؍ جون ۲۰۰۵ء بروز سنیچر ۱۲؍ بج کر ۵۵؍ منٹ۔

☆☆☆☆☆

قل أعوذ برب الناس

تفسیرِ ایوبی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لفظِ قرآن کے معنی اور اُس کی وجہ تسمیہ:

لفظ "قرآن" یا تو "قَرْءٌ" سے بنا ہے یا "قِراءۃ" سے یا "قَرْن" سے۔

"قَرْء" کے معنی جمع ہونے کے ہیں؛ "قرآن" کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بھی سارے اولین وآخرین کے علموں کا مجموعہ ہے۔

دین ودنیا کا کوئی علم ایسا نہیں جو قرآن میں جمع نہ ہو، قرآن میں خود ہے:

{نَزَّلْنا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ}

[ہم نے تم پر یہ قرآن اُتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔] (سورۂ نحل ۸۹)

"قراءۃ" کے معنی پڑھی ہوئی چیز۔ سارے صحیفے لکھے ہوئے آئے۔ اور قرآن پڑھا ہوا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آتے اور پڑھ کر سُناتے۔

اور پڑھا ہوا نازل ہونا، لکھے ہوئے نازل ہونے سے افضل ہے، نیز جس قدر قرآن پڑھا گیا، یا پڑھا جاتا ہے نہ کوئی دینی یا دنیوی کتاب پڑھی گئی اور نہ پڑھی جاتی ہے۔

"قَرْن" کے معنی ملنا، ساتھ رہنا ہے اس کو قرآن اس لیے کہتے ہیں کہ حق وہدایت، سورتیں، آیتیں ہر ایک بعض بعض کے ساتھ ہیں۔ کوئی کسی کا مخالف نہیں۔

عقائد، اعمال، پھر اعمال میں سیاسیات، اخلاق، معاملات سب ساتھ ہیں۔ نیز یہ ہر وقت مسلمانوں کے ساتھ رہتا ہے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۰)

نزولِ قرآن کتنی بار ہوا؟ چند طریقے سے چند بار ہوا ہے:

(۱) لوحِ محفوظ سے پہلے آسمان کی طرف یک بارگی نزول ہوا، جیسا کہ {شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ} [رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا۔ سورۂ بقرہ:۱۸۵] اور {إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ} [بے شک ہم نے اسے شبِ قدر میں اتارا۔ سورۂ قدر:۱] سے ثابت ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ پر رفتہ رفتہ تیئیس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔

(۳) حضور ﷺ کی خدمت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام رمضان شریف میں حاضر ہو کر قرآن سناتے تھے۔

(۴) بعض سورتیں دو بار نازل ہوئیں، جیسے سورۂ فاتحہ وغیرہ۔

غرض کہ نزولِ قرآن کئی طریقوں سے کئی بار ہوا، لیکن احکام اُس نزول سے جاری فرمایا کرتے تھے جو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ تھوڑا تھوڑا آتا تھا۔ قرآن کریم کے بارے میں کہیں "نَزَّلْنا" اور کہیں "اَنْزَلْنا" فرمایا گیا، تو "نَزَّلْنا" کا معنیٰ ہے آہستہ آہستہ ہم نے اتارا اور "اَنْزَلْنا" کا معنیٰ ہے ہم نے یک بارگی اتارا اس طرح "اَنْزَلْنا" اور "نَزَّلْنا" کا فرق معلوم ہو گیا۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۱۔ ۲۲)

قرآن کے نزول اور کتبِ سماوی کے نزول میں فرق:

(۱) سب (کتابیں) تحریری، یہ (قرآن مقدس) تقریری۔

(۲) سب (کتابیں) انبیاے کرام کو بلا کر دی گئیں اور قرآن عرب کے گلی کوچوں میں، بلکہ بسترِ مبارک پر بھی نازل ہوا۔

(۳) وہ کتابیں یک بارگی اتریں اور قرآن تیئس سال میں اترا، تاکہ ہم کلامی ہمیشہ جاری رہے اور مسلمانوں کو عمل کرنا آسان رہے۔ بنی اسرائیل یک دم تورات ملنے پر گھبرا گئے اور بولے {سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا} [یعنی: ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔ سورۂ بقرہ: ۹۳] (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۲)

قرآن کا نزول حضور ﷺ پر کیوں؟ بندوں کے لیے ضروری ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام مانیں لیکن یہ ماننا اس وقت ضروری ہوگا جب کہ نبی کریم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوں۔ حق تعالیٰ بغیر واسطہ کسی غیر نبی سے کلام نہیں کرتا ہے۔ اور اگر جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں آ کر رب کا کلام سناجاتے جب بھی عمل واجب نہ ہوتا۔ اسی طرح کوئی غیر نبی

الہاماً یا خواب یا غیبی آواز سے مطلع ہوجائے تو شرعاً اُس کا ماننا لازم نہیں ہے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام انسانی شکل میں حاضرِ دربار حضور ﷺ ہوئے اور عرض کیا، اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ احسان کیا ہے؟ جواب دیا، جب چلے گئے، ارشاد فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے، تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔ کیوں کہ اُن کو پتا تھا ڈائرکٹ میں کہوں گا تو ماننا واجب نہ ہوگا۔ اس لیے زبانِ مصطفی علیہ السلام سے کہلوایا۔

اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

(تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۲)

قرآن وحدیث کا فرق: قرآن اور حدیث دونوں ہی وحیِ الٰہی ہیں، دونوں کی اطاعت ضروری ہے، فرق اتنا ہے کہ قرآن کی عبارت اور مضمون دونوں خدا کی طرف سے ہے، جسے جبرئیل علیہ السلام نے سُنایا اور بلا فرق حضور علیہ السلام نے سُنا دیا۔

حدیث میں مضمون رب کی طرف سے ہوتا ہے اور الفاظ سرکار کے ہوتے ہیں، وحی، الہام کے ذریعہ یا فرشتہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا ماننا، اس پر عمل کرنا ضروری، لیکن قرآن کی جگہ تلاوت نہیں کرسکتے، عمل مضمون میں ہوتا ہے، تلاوت الفاظ کی۔

{یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ} [سورۂ بقرہ:۱۲۹]

[وہ (رسول) مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔]

{اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ} [سورۂ نساء:۵۹]

[یعنی: اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول (علیہ السلام) کی اور اپنے میں سے امر والوں کی۔] (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۳)

قرآن پاک کی ترتیب اور اُس کا جمع ہونا: قرآن پاک لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا تھا {قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ} [سورۂ بروج:۲۲] ۔ وہاں سے پہلے آسمان پر آیا۔ پھر وہاں سے تیئیس سال میں آہستہ آہستہ نازل ہوا، مگر یہ نازل ہونا لکھی ہوئی

ترتیب کے موافق نہ تھا، بلکہ بندوں کی ضرورت کے مطابق تھا، جیسے اگر اول ہی سے شراب کے حرام ہونے کی آیتیں اتر آتیں تو یقیناً عرب کے نئے مسلمانوں کے لیے دشواری واقع ہوتی، کیوں کہ وہاں عام طور سے شراب پی جاتی تھی، اسی طرح دیگر احکام بھی سمجھ لیں۔

سرکار کی نگاہ لوحِ محفوظ پر تھی۔

جب کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے کہ یہ آیت فلاں سورت کی فلاں آیت کے بعد لکھو۔ اور یہ ترتیب لوحِ محفوظ کے مطابق تھی، جو اونٹ کی کھال، ہڈیوں، کھجور کے پتّوں اور کاغذوں پر متفرق طور پر لکھ لیتے۔

اکثر صحابہ قرآن کے حافظ تھے، نماز میں تلاوت ضروری تھی اور پھر اکثر برکت کے لیے پڑھتے ہی رہتے تھے، اس لیے ضائع ہونے کا خوف نہ تھا۔ سرکار کے زمانے میں ترتیب تو مکمل تھی، لیکن کتابی شکل نہ ہوپائی تھی، کیوں کہ قرآن کا نزول جاری تھا، کچھ آیات کا نزول ہو چکا تھا، کچھ کا باقی تھا، لہذا ممکن نہ تھا۔

جہاد اور دیگر مصروفیات وضروریات سے موقع نہ مل سکا، حضور علیہ السلام کی وفات سے چند روز قبل نزول بند ہوا۔

حضور علیہ السلام کی وفات کے سال صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کی خلافت میں ملکِ یمامہ کے جھوٹے مدعیٔ نبوت مسیلمہ کذاب وغیرہ سے صحابہ کی جنگ ہوئی اور اس جنگ میں سات سو حافظِ قرآن شہید ہوئے، تب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ بارگاہِ صدیق میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اگر اسی طرح حفّاظ شہید ہوئے تو قرآن ضائع ہوجائے گا۔ تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ کو قرآن اکٹھا کرنے کا فریضہ سپرد کیا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ نے عرض کیا، جو سرکار نے نہ کیا آپ کیوں کرتے ہیں؟ تو ارشاد ہوا یہ اچھا کام ہے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۴۔۲۵)

اس سے بدعتِ حسنہ کا ثبوت ہوا۔

یہ نسخہ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس تھا، پھر فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کے پاس رہا، ان کے بعد فاروقِ اعظم کی بیٹی، اور نبی کریم ﷺ کی زوجۂ محترمہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالی عنہا کے پاس محفوظ رہا۔

پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ کے زمانہ میں قرآن کے متعلق اختلاف شروع ہوا، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالی عنہ آرمینیا اور آذربائیجان میں جہاد پر تھے، فارغ ہوکر دربارِ عثمانی میں پہنچے اور اختلاف کا ذکر کیا، پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالی عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ تعالی عنہ کی سربراہی میں مجلس بٹھائی اور کام شروع ہوا، چند نسخے تیار ہوئے اور یہ نسخے عراق، شام اور دیگر ممالک اسلامیہ میں بھیج دیے گئے۔

زمانہ رسالت میں سورتیں اور سات منزلیں مقرر تھیں، کئی کام بعد میں ہوئے، نقطے، اعراب و نونِ قطنی وغیرہ لگائے گئے، یہ کام حجاج بن یوسف کے زمانہ میں ہوا، رکوع لگائے گئے، کل رکوع پانچ سو چھپن (۵۵۶) ہیں، نمازِ تراویح کا رکوع ستائیس رمضان تک پانچ سو چالیس بنتا ہے۔

فائدہ: اس طرح تراویح بیس رکعت ہوئی [کہ بعض رکعتوں میں دو دو چھوٹی سورتیں پڑھ لی جائیں] اور آٹھ رکعت تراویح غلط ہے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۲۶۔۲۷)

قرآن کی حفاظت: تورات، انجیل، زبور و دیگر صحیفے جو قرآن سے پہلے کی کتابیں ہیں، خاص وقت اور خاص قوموں کے لیے بھیجی گئی تھیں، وہ کتابیں عام لوگوں کو حفظ نہ ہوتیں، صرف انبیاے کرام ان کے حافظ ہوتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن پیغمبرانِ عظام کے بعد لوگوں نے ان میں بہت تحریف و تبدیل کر دی۔

یہ قرآن پاک سارے جہان کے لیے آیا اور ہمیشہ کے لیے آیا، اس لیے رب نے خود اِس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا، ارشاد فرمایا: {اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ} [ہم نے

ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں۔ سورۃ حجر:۹] اور الحمد للہ ایسی حفاظت فرمائی کہ کوئی زیر زبر کا فرق نہ کر سکا۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۳۶)

تلاوتِ قرآن: تلاوتِ قرآن میں بزرگوں کی عادات مختلف رہی ہیں، کسی نے آٹھ ختم ایک دن رات میں کر لیا، کسی نے چار دن چار رات میں، کسی نے تین، کسی نے چار، بعض تین دن میں، بعض پانچ دن میں، بعض سات دن میں اور سات دن میں ختم کرنا اکثر صحابہ کا معمول تھا۔

تلاوت کرنے والا صحیح تلاوت کرے، صحیح تلاوت کرنے کا ثواب ہے۔ غلط پڑھنے کا کوئی ثواب نہیں۔ محض جلدی پڑھنے میں ثواب نہیں ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام اس طرح تلاوت فرماتے تھے کہ ایک ایک حرف صاف صاف معلوم ہوتا تھا۔

حضرت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم جب دل میں اترتا ہے تب اس میں جمتا ہے اور نفع پہنچاتا ہے۔ تلاوت کرنے والا جس سکون واطمینان کے ساتھ دنیا میں تلاوت کرتا تھا اسی اطمینان وسکون کے ساتھ تلاوت کرتا ہوا جنت میں جائے گا اور جہاں تک اس کی تلاوت ختم ہوگی، وہاں تک کا سب ملک اس کو دیا جائے گا۔

{ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ }

(میں نکالے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں)

غور طلب امور:

(۱) تلاوت سے پیش تر اسے کیوں پڑھتے ہیں؟

(۲) اس کی تفسیر کیا ہے؟

(۳) اس کے فوائد کیا ہیں؟

(۴) اس کے متعلق مسائل کیا ہیں؟

(ا) اس کے پڑھنے کی درج ذیل وجہیں ہیں۔

[ا] پڑھنے کی وجہ رب تعالی کا حکم ہے: {فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ}[جب تم قرآن پڑھنے لگو تو نکالے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ لو۔ سورہ نحل:۹۸]

[۲] حضور علیہ التحیۃ والثنا اور سارے صحابہ اور ساری امت کا اس پر عمل رہا ہے، لہذا سنت ہے۔

[۳] جس طرح نماز سے قبل وضو ہے جو قابلِ نماز بناتا ہے، اسی طرح تلاوت سے پہلے تعوذ ہے جو اندرونی پلیدی کو دور کر کے قابلِ تلاوت بناتا ہے۔

[۴] طریقہ ہے کہ جو بادشاہ کے دروازے پر آئے د اخل ہونے کی اجازت لے، جو بارگاہِ الہی میں حاضری چاہے وہ بھی اجازت لے جو تعوذ ہے۔

[۵] حاضری بارگاہ کے وقت درباری لباس چاہئے، یہ بارگاہِ الہی میں حاضری کے وقت گویا قلب کا لباس ہے اور زبان کا لباس ہے۔(تفسیر نعیمی ص ۴۰)

تفسیر: ''اَعُوْذُ '': ''عَوْذٌ '' سے بنا ہے۔(ا) التجا کرنا، پناہ پکڑنا(۲) ملنا۔ میں پناہ پکڑتا ہوں، التجا کرتا ہوں اللہ تعالی سے۔ میں اپنے نفس کو فضلِ الہی و رحمتِ الہی سے ملاتا ہوں۔

''شَیطان '' : ''شَطْنٌ ''یا ''شَیْط '' سے بنا ہے۔ دور ہونا۔ ہلاک ہونا یا باطل ہونا۔ چوں کہ ابلیس بھی مقرب بارگاہِ الہی ہو کر وہاں سے دُور ہوا اس لیے اس کو شیطان کہتے ہیں۔ اور چوں کہ ابلیس بھی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہوا اور اس کا سارا پچھلا کیا دھرا باطل ہو گیا اس لیے شیطان کہتے ہیں۔

''رَجِیْم '': ''مرجوم '' کے معنی میں ہے، ''مرجوم '' : ''رَجم '' سے بنا ہے، اور ''رجم '' کا معنی نکالنا، پھینک کر مارنا۔ لعنت (دور کرنے) کے معنی میں بھی آتا ہے۔

☆ چوں کہ شیطان فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا اور وہاں سے نکالا گیا اور فرمایا گیا:

{فَاخْرُجْ مِنْهَا} [جنت سے نکل جا۔ سورۂ حجر: ۳۴] اس لیے اسے رجیم کہا جاتا ہے۔

☆ اور آج بھی جب یہ آسمان پر جانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو شہاب [ٹوٹا ہوا تارہ] پھینک کر مارا جاتا ہے، لہذا یہ مرجوم ہوا۔

☆ اس پر ہمیشہ حق تعالی اور فرشتوں اور انسانوں کی لعنت پڑتی رہتی ہے: {اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ} [اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔ سورۂ حجر: ۳۵] (تفسیر نعیمی ۴۰۔۴۱)

خلاصہ: دینی و دنیوی آفتیں بے انتہا ہیں اور ہماری طاقت اور قدرت ان کو دور نہیں کر سکتی، کیوں کہ ہم کم زور ہیں۔ اور جب کم زور کسی بڑی مصیبت میں گھر جاتا ہے تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ بڑوں کی پناہ ڈھونڈھے۔ اور جتنی ہی بڑی آفت ہو اُتنی ہی قوی پناہ گاہ چاہئے۔ معمولی دشمن کو دفع کرنے کے لیے پولس کی پناہ کافی ہوتی ہے۔ اور بڑی مصیبت کو دفع کرنے کے لیے کبھی کپتان، کبھی ڈپٹی کمشنر، کبھی گورنر، کبھی وائسرائے، حتی کہ کبھی بادشاہ کی پناہ ضروری ہوتی ہے۔

چوں کہ شیطان نہایت قوی دشمن ہے، اُس کے وسوسے اور شیطنت غیر متناہی ہیں۔ اور اتنے بڑے دشمن سے بچنے کے لیے اس ذات کی پناہ ضروری ہے جو قادرِ مطلق ہے، حی وقیوم ہے۔ اس لیے انسان سے کہلوایا گیا کہ اے بندے! یہ کہہ کر میری پناہ میں آ {اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ}

یہاں یہ نہ کہا گیا کس وسوسہ سے پناہ، بلکہ مطلق رکھا گیا کہ سارے وسوسوں اور خباثتوں سے پناہ مانگتا ہوں۔ تو گویا بُرے عقائد، بُرے اعمال، اندرونی و بیرونی رکاوٹوں سے اللہ کی پناہ۔ (تفسیر نعیمی ص ۴۱)

صوفیانہ: جو چیز بھی سرکش ہو اور ہم کو ذکرِ الٰہی سے روکے وہ شیطان ہے، خواہ جن ہو یا انسان۔ کوئی چوپایہ ہو یا موذی جانور، خواہ نفس ہو یا جسمانی اور نفسانی عوارض یا کوئی دنیاوی کام، سب شیطان ہیں۔ ارشاد ہے {شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ} [سورۂ انعام: ۱۱۲] {مِنَ

الجِنَّةِ وَالنَّاسِ}[سورۂ ناس:٦]

حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ ایک خچر پر سوار ہوئے تو وہ اچھلنے کودنے لگا، اس کو بہت مارا، مگر اچھلتا کودتا رہا۔ اس پر سے یہ کہہ کر اُتر گئے کہ یہ شیطان ہے۔

اس صورت میں ''الشیطان'' میں الف لام جنس کا ہے اور مقصود یہ ہے کہ میں مطلق ہر شیطان کے فریب سے اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔

اس میں اشارہ اس جانب ہے کہ میں کم زور ہوں، قوی دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ نفس، شہوت، غصہ، حرص، ہوس، طمع وغیرہ اندرونی دشمن ہیں اور بُرا سماج، بُرا معاشرہ، بُرے یا ر، دنیاوی ضروریات، ہر عضو کی غلط خواہش یہ تمام خارجی دشمن ہیں۔ اتنی بے کسی و بے بسی میں انسان پکارتا ہے اور کہتا ہے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

(۱) ولی، مُرشد، حاکم کی پناہ پکڑنا تعوّذ کے خلاف نہیں، بلکہ یہ رب کی پناہ میں آنا ہے، اُن کی پناہ رب کی پناہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اُن کی بارگاہ میں جانے والا رب سے پھر گیا۔

رزق لینے کے لیے مال دار کے یہاں نوکری کرتے ہیں۔ روپیہ لے کر دُکانوں پر پھرتے ہیں، جب کہ رزّاق مولائے قدیر ہے۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم نے خُدا کو چھوڑ دیا، بلکہ اس کے حکم سے رزق تلاش کرنے کے لیے اُن جگہوں پر جاتے ہیں۔ یہ رزق کے دروازے ہیں، پیر کے یہاں جانا، نبی کے دامن میں چھپنا، یہ سب تعوذ پر عمل ہے۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر
ہست بس پُر آفت و خوف و خطر

(۲) اللہ کی پناہ میں انسان جب آسکتا ہے کہ کوئی اس پناہ میں لانے والا ہو۔ جج کی پناہ وکیل و مختار کے ذریعہ، تو انبیا اولیا تک آنا حقیقت میں رب کی پناہ میں آنے کا ذریعہ ہے۔

(تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۴۱۔۴۲)

کلماتِ تعوذ:

[الف] امام اعظم اور امام شافعی رحمہا اللہ تعالی کے نزدیک:

{اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم}

[ب] امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک:

{اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم}

[ج] امام اوزاعی اور امام سفیان ثوری رحمہا اللہ کے نزدیک:

{اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ}

[د] بعض روایتوں میں آتا ہے:

{اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم}

نکتے:

(۱) تعوّذ، خلق سے خالق کی طرف رجوع کرنا ہے۔ یہ تصوف کی پہلی سیڑھی ہے۔

(۲) تعوّذ اپنی عاجزی بے کسی و کم زوری اور رب کی قدرت کا اقرار ہے اور یہ نفس کے پہچاننے کی پہلی منزل ہے۔ ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَه فَقَدْ عَرَفَ رَبَّه'' [جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا]

(۳) شیطان دشمن اور رب تعالی مولی ہے۔ انسان رب سے ملنا چاہتا ہے، یہ راستہ روکتا ہے تو انسان پکارتا ہے: اے مولا! تو مجھے شیطان سے بچالے اور اپنی بارگاہ میں حاضر فرمالے۔ یہ وہ طلب ہے جس کے بغیر کوئی تصوف کی منزل طلب نہیں کر سکتا۔

(۴) ''قلوب المومنین عرش اللہ تعالی'' یعنی: مومنوں کا دل عرشِ الٰہی ہے، خدا نے جنت سے شیطان کو نکالا {اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا} [یہاں سے نکل جا، روکا گیا راندہ ہوا۔ سورۂ اعراف:۱۸] لہٰذا لازم ہے کہ خدا کے باغ کو اس کے لیے پاک کریں، پاک کے لیے پاک دل چاہیے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جو حضورِ قلب سے اعوذ باللہ پڑھ لیا کرے تو رب اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے حائل کر دیتا ہے۔ (تفسیر نعیمی، ص ۴۳۔۴۴)

{بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ}

(اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا [ہے])

غور طلب امور: تعوذ و تسمیہ میں تعلق ☆ اس کے نِکات ☆ فضائل ☆ فوائد ☆ تفسیر ☆ مسائل ☆

تعلق: ☆ تعوّذ میں ماسوا اللہ سے علاحدگی ہے، تسمیہ میں توجہ الی اللہ ہے۔ ماسوا اللہ سے علاحدگی، توجہ الی اللہ پر مقدم ہے۔

☆ تعوّذ میں برائیوں سے پرہیز ہے اور تسمیہ میں اچھے اعمال کا حصول ہے، پرہیز علاج پر مقدم ہے۔

نکات: (۱) کفّارِ عرب (بِسْم اللات وَالعُزّٰی) پڑھتے تھے، اس کی مخالفت کرائی گئی۔

(۲) ابتدا اچھی ہے تو انتہا بھی اچھی ہے، دکان دار پہلی بِکری نقد کرتا ہے، تولد پر اذان دی جاتی ہے وغیرہ۔

(۳) چوری سے بچنے کے لیے سرکاری مال پر سرکاری مہر لگائی جاتی ہے، شیطان چور ہے۔

(۴) آدمی جس کا ذکر زیادہ کرتا ہے اُسی کے ساتھ اُس کو رکھا جاتا ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انگشتری میں سرکار علیہ السلام کا نام کندہ کرایا تو اللہ کی طرف سے آپ کا نام بھی اس میں کندہ کر دیا گیا۔

(۵) دُنیا کے سارے کام حقیقت میں انسان کے لیے زہرِ قاتل ہیں ۔ رب کا نام

تریاق ہے۔

(۶) انسان کو چاہیے کہ ہر وقت اپنی عاجزی و نیاز مندی پر نگاہ رکھے اور رب تعالیٰ کی قدرت و رحمت و بے نیازی پر نگاہ رکھے، تاکہ ہم نہ پیدا ہو اور یہ بات جب ہوگی کہ ہمہ وقت مولیٰ پر دھیان رہے اور تسمیہ سے شروع کرے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۴۵۔۴۶)

حروفِ تسمیہ کے نکات: تسمیہ میں ب سے آغاز ہے اور اسم کے الف کو گرادیا گیا ہے، حالاں کہ وہ آیت کریمہ {اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ . . } میں لکھا جاتا ہے، تاکہ

(۱) حرفِ ''ب'' سے ''بلیٰ'' کے ذریعہ کیے گیے میثاق کو یاد دلایا جائے۔

(۲) ''ب'' میں عاجزی ہے۔ الف میں بلندی ہے۔

(۳) ''ب'' ملانے کے لیے آتی ہے۔ الف لاتعلقی پیدا کرتا ہے۔

''باللہ'' نہ کہہ کر ''بسم اللہ'' کہا گیا، اس میں یہ اشارہ ہے کہ

(۱) پہلے نام تک پہنچو، پھر ذات تک پہنچوگے۔ جس طرح ذات سے مدد مانگنا صحیح، اسی طرح اس کے نام سے بھی۔

(۲) اسم اللہ سے برکت لینا جائز ہے۔ اللہ کے بندوں سے بھی جائز۔

(۳) اسم اللہ غیر اللہ ہے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ۴۷۔۴۸)

سورۃ فاتحہ کے فضائل:

(۱) ایک مرتبہ ایک فرشتے نے آسمان سے نازل ہوکر حضور علیہ السلام سے عرض کیا: آپ کو مبارک ہو کہ آپ کو دو نور عطا کیے گئے جو کسی کو نہ ملے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ (مسلم شریف)

(۲) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: سورۂ فاتحہ کے مثل تورات، انجیل، زبور میں کوئی سورت نازل نہیں ہوئی۔ (ترمذی شریف)

(۳) رب تعالیٰ نے آسمان سے ایک سو چار کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے، مگر سو کتابوں

کے علوم چار میں رکھے، پھر اُن تین کے علوم قرآن پاک میں رکھے۔ (تفسیر کبیر)

(۴) جب یہ سورت نازل ہوئی جبریل علیہ السلام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے تھے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۶۰)

فوائد:

(۱) سو بار پڑھ کر دعا کرے قبول ہوگی۔

(۲) دوا کے لیے مریض کو زم زم زعفران سے ملا کر ۴۱ر روز پلانے سے شفا ہوگی۔

(۳) بعض گنہ گار قوموں پر عذاب ہونے والا ہوگا کہ قوم کا بچہ مکتب میں فاتحہ پڑھے گا اس کی برکت سے چالیس سال کا عذاب دور ہو جائے گا۔ (تفسیر کبیر)

(۴) جو دنیاوی مصیبت میں پھنس گیا ہو "بسم اللّٰہ" کی میم "الحمد" کی لام میں ملا کر پڑھے، نکل جائے گا۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۶۱)

مسائل:

(۱) ہر نماز میں پڑھنا واجب ہے۔

(۲) امام کے پیچھے مقتدی کو پڑھنا سخت منع ہے۔

☆ مسلم شریف میں ہے: "اِذا قُرِیَٔ فَانْصِتُوا" [جب قرآن کریم پڑھا جائے تو تم خاموش رہو]

☆ حدیث میں ہے: "قراءۃُ الإمام قراءۃٌ له" [امام کی قراءت، مقتدی کے لیے بھی قراءت ہے]

☆ اسّی (۸۰) جلیل القدر صحابہ منع فرماتے ہیں، حضرت علی و عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم شامل ہیں۔

☆ اگر پڑھنا ضروری ہوتا تو جو رکوع میں ملتا اس کی رکعت نہ ملتی۔

☆ دربار کے آداب سب کرتے ہیں، سلام سب کرتے ہیں، کلام ایک ہی کرتا ہے۔

☆ جو وارد ہے کہ "سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی" یہ خلاف نہیں ہے، جب امام نے پڑھی، ہوگئی۔

فائدہ: حدیث میں ہے: "فاتحہ نماز میں ضروری ہے" ۔ قرآن میں ہے "جب قرآن پڑھا جائے سنو اور خاموش رہو۔ امام پڑھے اور مقتدی خاموش رہے۔

حدیث میں ہے "بغیر فاتحہ نماز نہیں ہوتی ہے" اور قرآن میں ہے: {فاقرءُ وا مَا تَیَسَّرَ مِنَ القُرآن} [اب قرآن میں سے جتنا تم پر آسان ہو اُتنا پڑھو۔ سورہ مزّمل: ۲۰]۔ مطلقا قراءت فرض ہے اور سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔

مسئلہ: نمازِ جنازہ میں تلاوت کی نیت سے پڑھنا منع ہے، دعا کی نیت سے پڑھنا جائز ہے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۶۱۔ ۶۲)

سورۃ فاتحہ

{ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ }

(سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا)

قابلِ غور باتیں: (۱) سب سے پہلی آیت کیوں ہے (۲) اس کی عالمانہ تفسیر (۳) فائدے (۴) کچھ سوالات

(۱) چند وجہوں سے اس آیت کو پہلے رکھا گیا

☆ یہ وہ پہلا کلمہ ہے جو حضرت انسان کے منہ سے نکلا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی چھینک آئی، آپ نے فرمایا: "الحمدُ للہ رب العٰلمین"۔ اسی لیے ہم کو بھی حکم ہے کہ چھینک کر یہ پڑھیں۔

☆ "الحمد للہ" میں آٹھ حروف ہیں، جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔

☆ عبادت کی جان اللہ کی تعریف ہے، اس لیے پہلے بیان کیا۔

☆ اس میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنا ہر کام حمد سے شروع کریں۔

☆ جب بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ہو تو پہلے اس کی تعریف کی جاتی ہے، کسی کو خط لکھتے ہیں تو پہلے القاب وغیرہ ہوتے ہیں۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۶۳)

"الحمد" میں الف لام استغراقی ہے یا عہدی۔

استغراقی کا مفہوم: ہر حمد ہر زمانے میں، ہر حامد سے ہر حالت میں خاص ہے اللہ تعالٰی کے لیے۔ حمد کا عام ہونا الف لام سے حاصل ہوا۔ حمد عام، تو حامد عام۔ جملہ اسمیہ سے ہمیشگی معلوم ہوئی۔

توکوئی بھی کسی حالت میں حمد کرے وہ رب کی تعریف ہے، چاہے بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ کسی نبی، ولی، چاند، سورج، زمین، آسمان سب کی تعریف، رب کی تعریف ہے، کیوں کہ مصنوع کی تعریف صانع کی تعریف ہے، یوں ہی نعت شریف بھی رب کی تعریف ہے۔

پھر زبان سے، ہاتھ سے، پیر سے، مال سے، قربانی سے اللہ کی عملی تعریف ہے۔ طوافِ کعبہ، زیارت اور اس کی تعظیم بھی اس کی عملی تعریف ہے { وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ } [جو شخص رب کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو وہ شخص متقی ہے۔ سورۂ حج:۳۲] کچہری کی عزت، حکومت کی عزت ہے۔ اس کی توہین حکومت کی توہین ہے۔

خدا کی نعمت پر شکر، مصیبت پر صبر، رب کی تعریف ہے۔ ہر عضو کی حمد علاحدہ ہے۔ جب سے وقت ہے جب تک وقت رہے گا حمد ہوتی رہے گی { وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ } [ہر چیز رب کی حمد اور اس کی تعریف کرتی ہے۔ سورۂ اسراء:۴۴] (تفسیر نعیمی پارہ اول ۶۴)

الف لام عہدی کا مفہوم: وہ خاص حمد اللہ کی ہے۔

☆ ہر حمد مقبول نہیں، بلکہ خاص حمد مقبول ہے، وہ خاص حمد کون سی ہے؟

وہ خاص حمد وہ ہے جو اُس کے محبوب نے اپنے رب کی کی، یا اُن کے بتانے سے کوئی کرے۔ اس لیے حضور کا اسم شریف "احمد" اور رب کا نام "محمود" ہے۔

☆ **حدیث شفاعت**: رب تعالیٰ قیامت میں ہم کو اپنی خاص حمدیں الہام فرمائے گا، ہم سجدہ میں اُن سے رب کی حمد کریں گے اور اپنی امت کی شفاعت کریں گے۔

☆ حقیقت بھی یہ ہے کہ آج سکھ، عیسائی، ہندو آریہ سب حمد کرتے ہیں، مگر اُن کی حمد مردود ہے اور مسلمانوں کی حمد مقبول ہے؛ کیوں کہ مسلمان اُس کے محبوب علیہ السلام کی بتائی ہوئی حمد کرتے ہیں اور باقی لوگ اُن سے علاحدہ ہو کر۔

یا (اس کا معنی یہ ہے کہ) وہ خاص حمد مقبول ہے جو سرکار علیہ السلام کی نعت کے ساتھ

ہو۔ جس کی حمد نعت سے خالی ہو مردود ہے، شیطان کی ساری حمد بے کار، تمام کفار کی ساری حمد بے کار، کیوں کہ وہ نعتِ مصطفی کی چاشنی سے خالی ہے، اسی لیے کلمہ، اذان، خطبہ، نماز سب میں ذکرِ مصطفی ونعت شریف ہے۔

ذکرِ خدا جو اُن سے جُدا چاہو نجدیو
واللہ ذکرِ حق نہیں کنجی سقر کی ہے
ذکر سب پھیکے جب تک نہ مذکور ہو
حسن نمکین والا ہمارا نبی

(یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ) وہ خاص حمد خدا کی ہے، یعنی ساری مخلوق سرکار کی مدح وثنا کرے، لیکن جیسی چاہیے نہیں کر سکتی، بلکہ محبوب علیہ السلام کی کامل حمد وہی ہے جو رب نے کی ہے، اس لیے رب کا نام "حامد" اور محبوب کا نام "محمّد" ہے۔ یہ نعتِ مصطفی بھی ہے اور حمدِ خدا بھی۔

☆ حمد ☆ مدح ☆ شکر

حمد: اختیاری خوبی بیان کرنا، دے یا نہ دے۔

شکر: اختیاری خوبی ظاہر کرنا، اس لیے کہ اس نے دیا ہے۔

مدح: اختیاری وغیر اختیاری خوبی بیان کرنا، جیسے موتی کی تعریف۔

{لِلّٰهِ} میں لام اختصاص کے لیے یا ملکیت کے لیے یا استحقاق کے لیے ہے۔ (تفسیر نعیمی، پارہ ص ۶۵)

تفسیر صوفیانہ: حمد کا معنی محمود کے کمال کو ظاہر کرنا ہے، جو کمال دنیا میں ہے وہ رب کا ہے، دنیا کی چیزوں کے کمال کا ظہور رب کی حمد ہے، کوئی کرے یا نہ کرے، خدا کی حمد ہے ، جسم کی بناوٹ، قوت وغیرہ سے اس کی حمد ہوتی ہے۔ اسی لیے آیا ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَه فَقَدْ عَرَفَ رَبَّه" [جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا]

مسائل:

☆ جمعہ کے خطبہ میں حمد پڑھنا واجب ہے۔

☆ نکاح، دعا، ہر کام کے شروع میں اور کھانے کے بعد حمد مستحب ہے۔

☆ چھینک کے بعد سنت موکدہ ہے۔

{الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾}

(بخشنے والا مہربان، روزِ جزا کا مالک، ہم تیری ہی عبادت کریں اور تجھ ہی سے مدد چاہیں، ہم کو سیدھا راستہ چلا)

{صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ}

(راستہ اُن کا جن پر تو نے احسان کیا)

تعلق: (۱) سیدھے راستہ میں گنجائش تھی۔ اس میں بیان ہو گیا کہ اے اللہ ہم اُن کا راستہ مانگتے ہیں جن پر تو نے احسان کیا، اس میں سیدھے راستے کی پہچان ہے، یعنی: اللہ کے نیک بندوں کا راستہ۔

(۲) پہلے راستہ، اور اب راستے کا رہبر۔

(۳) سیدھا راستہ وہ جو افراط وتفریط سے خالی ہو۔ (اب یہاں) تین جماعتیں ہیں۔ درمیانی راستہ تیرے خاص بندوں کا ہے۔ افراط والا {الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ} کا راستہ اور تفریط کا راستہ {ضَآلِّيْنَ} کا ہے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ۹۲)

تفسیر عالمانہ: راستے دو ہیں (۱) مخلوق سے خالق کی طرف۔ (۲) خالق سے مخلوق کی طرف۔ مخلوق سے خالق کی طرف جو راستہ ہے وہ بہت خطرناک ہے، بہت قافلے لُٹ جاتے ہیں۔ اس پر جگہ جگہ ڈکیتی ہوتی ہے، سردار ابلیس کا اعلان ہے {لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ

صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ }[ضرور تیرے سیدھے راستہ میں اُ ن کی تاک میں بیٹھوں گا۔ سورۂ اعراف:۱۶] توضرورت تھی کہ راستہ پر جگہ جگہ چوکیاں ہوں آفیسران ہوں تاکہ کسی کی ہمت نہ پڑے۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ۹۲)

{اَنْعَمْتَ}: "اِنْعام" سے بنا ہے۔ نعمت دینا۔ نرمی کرنا۔ اصطلاح میں نعمت سرور اور لذت کو کہتے ہیں۔ اب نعمت سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس سے انسان کو راحت حاصل ہوتی ہے، مال و دولت کو نعمت کہتے ہیں۔ نعمت تین طرح کی ہوتی ہے:

(۱) جو بلا اسباب، رب کی طرف سے ایجاد ہوتی ہے، جیسے: زندگی، بچپن کا رزق اور ہدایت وغیرہ۔

(۲) جو کسی بندے کے ذریعہ سے پہنچتی ہے، جیسے: دنیاوی مال وغیرہ۔

(۳) جو ہمارے اعمال کے ذریعہ ہم کو مِلے، جیسے بعض عمل سے رزق بڑھتا ہے اور جنت وغیرہ۔

ان تینوں کی مثال یہ ہے کہ ایک ایمان و عمل کے ذریعہ جنت پاتا ہے، جیسے اللہ کے مطیع بندے۔ دوسرا کسی کے طفیل، جیسے مسلمان کے نابالغ بچے۔ تیسرا بغیر کسی سبب کے جنت میں جاتا ہے، جیسے: حور و غلمان وغیرہ۔

پہلی قسم کی نعمت دو طرح کی ہے، ایک دنیاوی، جیسے اعضاے جسمانی۔ دوسری دینی، ایمان اور ہدایت وغیرہ، یہی مراد ہے۔

اللہ تعالی نے سب کو نعمتیں دی ہیں، کفار و مشرکین کو بھی، لیکن دینی نعمتیں ہی مراد ہیں، کیوں کہ دینی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیاوی نعمتیں حقیر ہیں۔ دنیاوی نعمتیں فانی اور یہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔

فوائد:(۱) صدیق کا راستہ حق ہے۔ ارشاد ہے {اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ}[جب اپنے یار سے فرماتے تھے: غم نہ کھا، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ سورۂ توبہ: ۴۰] اور

ارشاد ہے {سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكّٰى} [اور بہت جلد اُس سے دور رکھا جائے گا جو سب سے بڑا پرہیز گار ہے، جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو۔ سورۂ لیل: ۱۷، ۱۸]

(۲) امام کی تقلید ضروری ہے، راستہ بھی ضروری، رہبر بھی ضروری۔ تقلید شرک یا حرام ہوتی تو حدیث کا علم مِٹ جاتا، سب سندوں میں مقلدین ہیں۔

(۳) اچھوں کی پیروی اچھی اور بروں کی پیروی بُری ہے۔

(۴) جس پر نیک بندے چلے وہ راستہ سیدھا ہے، حدیث میں ہے: "مارآہ المؤمنون حسناً فھو عند اللہ حسنٌ" [جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالی کے نزدیک بھی اچھا ہے] اور ارشاد ہے "اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ فِي الْأَرْضِ" [تم روے زمین میں اللہ تعالی کے گواہ ہو]۔

(۵) جس میں اولیا ہوں وہی سچا ہے جو دین ولایت سے خالی ہو وہ جھوٹا ہے۔ (تفسیر نعیمی، پارہ اول ص ۹۸)

☆ کافروں کو نعمت ملی ہی نہیں۔ مال اولاد، مسلمانوں کے لیے نعمت ہیں، کافروں کے لیے زحمت۔ ایک شخص نے دوست کو خالص حلوا اور دشمن کو زہر آلود حلوا دیا، دونوں کو حلوا دیا، دوست کے لیے رحمت، دشمن کے لیے زحمت۔ یا یوں کہیے کہ حلوا صحت مند کے لیے مفید اور بیمار کے لیے زہر۔

☆ اجماعِ امت بھی ضروری ہے۔ اور یہ اجماع دلیلِ شرعی ہے۔

{آمین} "آمین" اسم فعل ہے، اس کا معنی "ایسا ہی کر" یا "قبول فرما"۔ یہ کلمہ نہ قرآن ہے، نہ قرآن کا کلمہ، نہ لکھا گیا، نہ کسی نے قرآن ہونے کا دعوی کیا۔

فضائل:

(۱) حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا، فاتحہ کے لیے "آمین" ایسی ہے جیسے کتاب کے لیے مہر، جس پر کتاب مکمل ہوتی ہے۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا: آمین رب العالمین کی مہر ہے، مہر والا مکتوب کوئی نہ کھولے، ویسے ہی آمین والی دعا کو کوئی نہ کھولے، نہ ضائع ہو، بلکہ قبول ہو۔

(۳) ''آمین'' میں چار حرف ہیں۔ اور ''آمین'' کہنے والے کے لیے چار فرشتے دعاے مغفرت کرتے ہیں۔

(۴) حدیث شریف میں ہے: جب امام ''ولا الضالین'' کہے تو ''آمین'' کہو، فرشتے بھی ''آمین'' کہتے ہیں، جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوئی اس کے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔ (مشکوۃ شریف ص ۷۹)

(۵) شیطان اس دعا سے مایوس ہو جاتا ہے جس کے آخر میں آمین کہہ دی جائے، کیوں کہ سمجھتا ہے، آمین کہہ دی گئی، مہر لگ چکی، اس کو توڑا نہیں جا سکتا۔

مسائل:

(۱) امام کے پیچھے آہستہ کہی جائے، بلکہ نماز کے علاوہ بھی آہستہ کہنا بہتر ہے۔

(۲) اس کا آہستہ کہنا قرآن، حدیث، عملِ صحابہ اور عقلی دلائل سے ثابت ہے۔

قرآن: قرآن پاک میں ہے: {اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً} [سورۂ اعراف: ۵۵] دعا عاجزی اور چپکے سے کرنی چاہیے، اور آمین بھی دعا ہے۔

نیز ارشاد ہے: {وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ} [اے میرے محبوب! جب میرے بندے میرے بارے میں سوال کریں تو کہہ دو کہ میں بہت قریب ہوں، دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہوں۔ سورۂ بقرہ: ۱۸۶] چیخنے کی ضرورت نہیں۔

حدیث: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، جب حضور علیہ السلام ''غیر المغضوب علیھم ولا الضالین'' پر پہنچے تو فرمایا: آمین، واخفی بھا صوتہ یعنی اپنی آواز پست کی۔

فرشتے کی آمین کوئی سنتا نہیں اور موافق جب ہوگی کہ آہستہ کہیں۔

امام نخعی فرماتے ہیں: چار چیزیں آہستہ کہی جائیں، تعوذ، تسمیہ، ثنا اور آمین۔

عقلی دلیل: آمین کے علاوہ جتنی دعائیں نماز میں ہیں آہستہ پڑھی جاتی ہیں، دعاے قنوت، دعاے ماثورہ آہستہ پڑھی جاتی ہے، آمین بھی دعا ہے تو آہستہ پڑھنی چاہیے۔ ہر نماز میں قرآن اور تکبیروں کے علاوہ کوئی ذکر بلند آواز سے نہیں کیا جاتا اور آمین بھی تلاوت اور تکبیر کے علاوہ ہے تو وہ بھی آہستہ ہونی چاہیے۔

سورۂ بقرہ

{الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ}
(وہ بلند رتبہ کتاب کوئی شک کی جگہ نہیں)

{ ذٰلِكَ} "ذٰلک" اسم اشارہ ہے، اس کا معنیٰ "وہ" ہے۔ اہلِ کتاب کو سنانا مقصود ہے کہ تورات انجیل وغیرہ میں جو وعدہ ہوا تھا وہ یہی کتاب ہے۔ (تفسیرِ نعیمی پارہ اول ص ۱۱۴)

{الْكِتٰبُ} یہ "کتب" سے ہے، معنیٰ:

(۱) جمع ہونا، لشکر کو "کِتَبِیۃ" کہتے ہیں۔
(۲) لازم کرنا، {كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ} [سورۂ بقرہ:۱۸۳]
(۳) دلیل وحجت، {فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ} [سورۂ صافات:۱۵۷]
(۴) میعاد یا مدت، {وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ} [سورۂ حجر:۴]
(۵) غلام کو مکاتب کرنا، {وَ الَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ} [سورۂ نور:۳۳]
(۶) لکھنا، لکھی ہوئی چیز۔

اس جگہ جمع ہونا مراد ہے یا لکھی ہوئی چیز۔

☆ یہ جمع کی ہوئی چیز، اس میں سب جمع ہیں۔ سارے علوم جمع ہیں تو گویا یہ کتاب کامل ہے۔ سارے علوم قرآن میں ہیں، ارشاد ہے {تفصیل الکتٰب} [سورۂ یونس:۳۷] اور ارشاد ہے {ولا رَطْبٍ ولا یابِسٍ} [سورۂ انعام:۵۹] اور سارا قرآن حضور کے علم میں ہے {اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ} [سورۂ رحمٰن:۱،۲] تو جو کوئی حضور کو عالمِ قرآن مانے تو حضور کو سارے علوم کا عالم ماننا، ورنہ آیت کا انکار ہے۔

☆ دوسرا معنیٰ مراد لینے پر معنیٰ یہ ہوگا کہ لکھی ہوئی چیز ہے، یعنی لکھنے میں کامل یہی

کتاب ہے، اس کے سوا سب ناقص۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۱۱۴)

یہ کتاب لوح محفوظ میں لکھی گئی، پھر آسمان پر لکھی گئی، پھر مسلمانوں کے سینوں میں، اور ہڈیوں، پتھروں وغیرہ پر، پھر کاغذ پر۔ اور کاغذ پر اس قدر لکھی گئی کہ اس کی مثال دوسری کسی کتاب میں مل ہی نہیں سکتی۔ (تفسیر نعیمی پارہ اول ص ۱۱۴)

انسان جو کتاب بھی لکھتا ہے، دو تین بار چھپ کر ختم ہو جاتی ہے، تورات وانجیل بھی ختم ہو گئیں۔ لیکن قرآن پاک نے اِس زمانے میں بھی پریسوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ (تفسیر نعیمی ج ۱، ص ۱۱۴)

{ لَا رَيْبَ فِيهِ }

"لا" لائے نفی جنس ہے۔

"ریب" : "ریبۃ" سے ہے، قلق، پریشانی، نئی بلا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: "رَیْبُ الزمان" یعنی: زمانہ کی مصیبتیں۔

اصطلاح میں اُس شک کو کہتے ہیں جس میں بدگمانی پائی جائے، چوں کہ "ریب" میں بھی دل کو پریشانی وبے اطمینانی ہوتی ہے اس لیے اس کو ریب کہا جاتا ہے۔

کلام کا مقصود یہ ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہونے میں اس قدر ظاہر ہے کہ اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ یا اس قدر دلائل ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے شک کی گنجائش نہیں۔ (تفسیر نعیمی ج ۱ ص ۱۱۸)

(۱) قرآن اس ملک میں آیا جہاں کے باشندوں کو اپنی زبان دانی اور فصاحت وبلاغت پر ناز تھا، وہ اپنے کو عربی (بولنے والا) اور دوسروں کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ قرآن نے سب کو مقابلے کی دعوت دی، لیکن کوئی مقابلہ نہ کر سکا، اور جس کا مقابلہ نہ ہو سکے وہ کتابِ الٰہی ہے۔

(۲) قرآن جس ذات پر آیا اُن کے پاس اس کی اشاعت کا کوئی ظاہری سامان نہ تھا، نہ مال، نہ یار، نہ مددگار وغیرہ۔ اپنے بھی دشمن۔ نہ قلم، نہ کاغذ، نہ ریڈیو وغیرہ۔ پھر بھی کم مدت

میں پھیل گیا، یہ کلامِ الٰہی ہونے کی قوی دلیل ہے۔

(۳) ایسے لوگوں میں آیا جو دنیوی تہذیب سے بالکل ناآشنا تھے، گویا یوں کہو کہ علم وتہذیب اُن تک پہنچا ہی نہیں تھا، چوری، ڈکیتی، زنا، خوں ریزی، جنگ وجدال اُن کی پیدائشی عادتیں تھیں، اُن کو کیا بنا دیا۔

(۴) اُس کی چھوٹی چھوٹی آیتیں بھی فصاحت وبلاغت سے بھری ہوئی تھیں، امام فخر الدین رازی نے صرف ''اعوذ'' سے دس ہزار مسائل نکالے ہیں۔ ایک بزرگ نے ''بسم اللہ'' کی چار لاکھ ترکیب کی ہے۔ یہ جامعیت اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے۔

(۵) اُس کی آیتوں میں کشش ہے، اَن پڑھ لوگ بھی اس کو سن کر روتے ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ تعالی عنہ کی تلاوت پر مشرکین کی عورتیں بچے وغیرہ گریہ کرتے۔

(۶) عرب کے بڑے بڑے نامور فصیح وبلیغ عالم جب اس کا مقابلہ کرنے کے لیے آتے تو اس کو سن کر سجدہ کر دیتے تھے۔

سوال: لوگوں کو شک ہے، پھر اس کی نفی کیسے صحیح ہے؟

جواب: اس آیت میں شک کی نفی کتاب سے کی گئی ہے نہ کہ لوگوں سے، اگر لوگوں کے دلوں میں شک ہے تو اُس کا انکار نہیں۔

کلام تو سچا تھا، لیکن لوگ اپنی ضد اور بے علمی کی وجہ سے انکار کرنے لگے۔ (ایضاص ۱۱۸۔۱۱۹۔۱۲۰)

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ }

(ہدایت ہے ڈر والوں کو)

{متقی} یہ ''وَقْیٌ'' اور ''وِقَايَة'' سے بنا ہے۔ معنی حفاظت اور پردہ ہے۔ اصطلاح میں یہ ہے کہ انسان اُن کاموں سے بچے جو اس کے لیے آخرت میں نقصان دہ ہوں۔

تقویٰ کے تین درجے ہیں:

(۱) دائمی عذاب سے بچنا۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان متقی ہے۔

(۲) عام گناہ سے بچنا۔ اس لحاظ سے پرہیزگار لوگ متقی ہیں۔

(۳) اس کام سے بچنا جو حق تعالیٰ سے روکے۔ اس لحاظ سے اولیاء اللہ اور انبیاے کرام متقی ہیں۔ (ایضاً ص ۱۲۰)

آخری درجہ کی دو صورتیں ہیں:

(۱) دنیا سے تعلق ہی نہ رکھے، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور تارک الدنیا فقیر۔

(۲) تعلق سب سے ہو مگر دل کا تعلق رب سے ہو، "دل بیار و دست بکار" کی جلوہ گری ہو، جیسے غوث پاک اور ان اولیاے کرام کا طریقہ مبارک رہا جو دنیوی کاروبار سے تعلق رکھتے تھے اور جیسے کہ حضرت سلیمان و یوسف علیہما السلام نے عمل فرما کر ظاہر فرمایا۔

لہٰذا یہ قرآن عام لوگوں کو اسلام کی ہدایت ہے۔ خاص لوگوں کے لیے ایقان و احسان کی، خاص الخاص کے لیے حجاب دور کرنے اور جمالِ یار کے مشاہدے کی۔

قرآن میں "تقویٰ" چند معنی میں آیا ہے:

(۱) ایمان (۲) توبہ (۳) فرماں برداری (۴) گناہ چھوڑنا (۵) اخلاص۔ خوفِ خدا بھی تقویٰ ہے۔ خوف دو طرح ہوتا ہے (۱) ایذا کا خوف، جو موذی سے ہوتا ہے، جیسے سانپ اور چور سے۔ (۲) طاقت و قدرت کا خوف، جو سلطان سے ہوتا ہے۔

فائدہ: ایذا کے خوف سے انسان بھاگتا ہے، جیسے سانپ اور چور سے۔ اور طاقت وقدرت کا خوف اطاعت کراتا ہے۔ رب سے دوسرا خوف چاہیے۔

پھر قدرت کا خوف دو طرح ہے۔ (۱) ناامیدی کا خوف۔ ناامیدی کا خوف گناہ پر دلیر کرتا ہے، جیسے مغلوب بلی کتے پر حملہ کر دیتی ہے۔ (۲) امید کا خوف۔ یہ گناہ سے بچاتا ہے، یہاں یہی مراد ہے۔ ارشاد ہے: "الایمان بین الخوف والرجاء" [ایمان خوف اور امید کے

درمیان ہے]

تقویٰ نہایت ضروری چیز ہے۔ قرآن میں ہے: {اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ} [تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ سورۂ حجرات: ۱۳] اور ارشاد ہے {اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا} [یعنی: اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ سورۂ نحل: ۱۲۸] (تفسیر نعیمی ج ا ص ۱۲۱)

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ سرکار علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ”جو چاہتا ہے کہ اُس کی عزت ہو وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے“۔ (ایضاً ص ۱۲۱)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے متقی کی پہچان یہ بتائی کہ گناہ پر قائم نہ رہے اور عبادت پر غرور نہ کرے۔ (ایضاً ۱۲۲)

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”متقی وہ ہے جو اللہ کے مقابلے میں غیر کو اختیار نہ کرے اور ساری چیزیں اللہ کے قبضہ میں جانے“۔ (ایضاً ص ۱۲۲)

حدیث میں ہے: ”متقی وہ ہے جو شبہ سے بچے“۔

حضرت ابن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چالیس گھڑے گھی تھا، غلام نے خبر دی کہ مرا ہوا چوہا ایک گھڑے سے نکلا ہے، پوچھا، کس گھڑے سے، عرض کی معلوم نہیں، فرمایا: سب گھڑوں کا گھی پھینک دو۔

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرض دار کے مکان کا سایہ نہ لیا اور تیز دھوپ میں کھڑے رہے۔ کسی نے عرض کیا کہ اے امام دھوپ تیز ہے، سایے میں آجایئے، فرمایا: میں خوف کرتا ہوں کہ یہ سایہ لینا سود نہ بن جائے۔

صوفیۂ کرام فرماتے ہیں: ”متقی وہ ہے کہ جو اپنے یومِ میثاق کے وعدہ کو پورا کرے“۔ ارشاد باری ہے: {اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ} [تم میرا وعدہ پورا کرو، میں تمھارا وعدہ پورا کروں گا۔ سورۂ بقرہ: ۱۵۲] (ایضاً ص ۱۲۲)

{اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ}

(وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں)

تعلق: پہلے قرآن کو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت بتایا گیا، یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ متقی کون لوگ ہیں۔ تقوی کا معنی ناجائز باتوں سے بچنا اور اچھی باتوں کا اختیار کرنا تو مطلب یہ ہوا کہ متقی وہ ہے جو ناجائز باتوں سے بچے اور اچھی باتیں اختیار کرے، اس آیت میں اچھی باتوں کا ذکر ہوا۔ چوں کہ بیماری کا دفع کرنا مقویات پر مقدم ہے۔ اس لیے تقوی کا ذکر پہلے ہوا۔

ایمان اصل ہے۔ اور اعمال پھل پھول ہیں؛ اس لیے ایمان کا ذکر پہلے اور اعمال کا بعد میں ہے۔ دل (محل ایمان) ایک تختی ہے اور اعمال اچھے نقوش۔ (تفسیر نعیمی ج ا ص ۱۲۴)

یؤمنون": "ایمان" سے مشتق ہے، جس کا معنی امن دینا ہے۔ چوں کہ مومن اچھے عقیدے اختیار کرکے اپنے کو ہمیشہ کے عذاب سے امن دے لیتا ہے اس لیے اچھے عقیدہ کے اختیار کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔

ایمان کا ایک اور معنی مضبوط کرنے اور بھروسا کرنے کے ہیں۔ مومن کو اپنے عقیدے پر بھروسا ہوتا ہے اور کافر کو تردد رہتا ہے۔ (ایضا ص ۱۲۴۔۱۲۵)

شریعت میں ایمان کا معنی: جن باتوں کے متعلق معلوم ہوجائے کہ یہ دینِ محمدی میں سے ہیں اُن سب کو دل سے یقینا ماننا اور زبان سے اقرار کرنا ایمان ہے۔ لیکن دلی تصدیق اصل ایمان ہے اور اقرار احکام اسلامی جاری کرنے کی شرط ہے۔

اعمال دین میں داخل نہیں یعنی اگر کوئی شخص عقیدہ درست رکھتا ہو لیکن اعمال نہ کرتا ہو یا برے اعمال کرتا ہو تو وہ مومن ہے، اس لیے اس آیت کریمہ میں ایمان کے بعد نماز وغیرہ کا ذکر ہوا، اگر اعمال ایمان کا جز ہوتے تو ایمان کے بعد اعمال کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس کی ایک دلیل اللہ تعالی کا یہ قول ہے {وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا} [یعنی: اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کر بیٹھیں۔ سورہ حجرات:۹]

دیکھیے آپس میں لڑنا حرام ہے، لیکن ان لڑنے والوں کو مومنین کہا گیا اگر کوئی شخص عمر بھر نیک اعمال کرے لیکن مرتے وقت اس کے عقیدے بگڑ جائیں تو وہ بے ایمان ہے۔

قرآن فرماتا ہے: { لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ.. } [سورہ حجرات: ۲] یعنی: اگر تم نے نبی کی آواز پر اپنی آواز اونچی کی تو تمھارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ اگر ایمان صرف اعمال کا نام ہوتا تو ادنیٰ بے ادبی سے اعمال برباد کیوں ہوتے۔

حضور علیہ السلام کو صرف جاننے پہچاننے کا نام ایمان نہیں، ماننے کا نام ایمان ہے۔ کفار آپ کو پہچانتے تھے، مگر مانتے نہ تھے کافر رہے، ارشاد ہے: { یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَھُمۡ } [کفار آپ کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسا اپنے لڑکوں کو پہچانتے ہیں۔ سورہ بقرہ: ۱۴۶]

ماننا تین طرح کا ہوتا ہے (۱) ڈر سے ماننا (۲) لالچ سے ماننا۔ یہ دونوں ایمان نہیں کہ منافق بھی ڈر اور لالچ سے مانتے تھے۔ (۳) محبت سے ماننا۔ یہی ایمان ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔

"غیب" کا معنی غائب، چھپی ہوئی چیز ہے۔ اور اصطلاح میں وہ ہے جو حواسِ ظاہری و باطنی و عقل سے چھپی ہو۔

غیب دو طرح کا ہے۔

(۱) ایک وہ جس پر دلیل قائم نہ ہو سکے، جیسے موت کا وقت، قیامت کی تاریخ، پیٹ کا بچہ۔ یہ مفاتیح الغیب ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے { عِنۡدَہٗ مَفَاتِحُ الۡغَیۡبِ } [سورہ انعام: ۵۹] اس پر آگہی اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہوگی۔

(۲) جس پر دلائل قائم ہو سکیں، یعنی دلائل سے پتا چلے، جیسے: حق کی ذات، نبوت، قیامت، سزا و جزا، حساب، جنت و دوزخ وغیرہ۔ یہاں یہی مراد ہے، جو نہ مانے کافر ہے۔

روح البیان میں ہے: غیب دو ہیں۔ (۱) ایک وہ جو تجھ سے غائب ہے، جیسے عالَمِ ارواح، کہ پہلے تو وہاں موجود تھا، اور جب تو یہاں آگیا تو وہ تجھ سے غائب ہو گیا۔ (۲) دوسرا وہ

جس سے تو غائب ہے، یعنی وہ تیرے پاس اور تو اس سے دور، جیسے حق تعالی کہ وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

اس آیت کے تین معنی ہیں:

(۱) وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

(۲) وہ غیب (یعنی دل) سے ایمان لاتے ہیں، منافق کی طرح نہیں۔

(۳) وہ غیب میں ایمان لاتے ہیں، یعنی مسلمانوں کے پیچھے بھی، اور سامنے بھی۔ منافق مسلمانوں سے کہتے ہم ایمان لائے اور کافروں سے کہتے {اِنَّا مَعَکُمْ} [یعنی: ہم بلا شبہہ تمھارے ساتھ ہیں] (تفسیر نعیمی ج ۱، ص ۱۲۶)

فائدہ:(۱) معلوم ہوا غیب پر ایمان لانا معتبر ہے، نہ کہ ظاہر پر، قرآن کے ظاہر کو ماننا ایمان نہیں، اوصافِ باطن کو ماننا ایمان ہے۔

خدا نے ہر چیز میں غیب و شہادت رکھے ہیں، جسمِ ظاہر شہادت ہے، قلب و روح غیب۔ درخت شہادت ہے، رس غیب۔ ایسے ہی ایمانیات میں غیب و شہادت ہے۔ ابلیس نے آدم علیہ السلام کے ظاہر کو دیکھا، غیبی صفت، خلافتِ الہیہ نہ دیکھی، مارا گیا۔ قرآن کے ظاہرِ الفاظ شہادت اور اُس کا کلامِ الہی ہونا غیب ہے۔ بشریت شہادت، نورانیت غیب ہے۔ (تفسیر نعیمی ج/ا ص ۱۲۶۔۱۲۷)

سوال(۱): غیب پر ایمان کیوں ضروری ہے؟

جواب: دیکھ کر تو سب مان لیں گے، لیکن وہ چیز جو غائب ہے اور عقل میں نہ آئے اس کو صرف اس لیے ماننا کہ نبی علیہ السلام کا حکم اور فرمان ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دل میں اطاعت ہے اعتماد ہے۔ مرتے وقت کا ایمان قبول نہیں کہ دیکھ کر ماننا نبیوں کی خبر پر اعتماد نہیں ہے۔

ایما ن کی جان یہ ہے کہ نبی کی خبر پر اپنے تمام حواس و عقل سے زیادہ اعتماد ہو۔ ہم غلطی

کر سکتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔

سوال (۲): صحابہ دیکھ کر ایمان لائے حالاں کہ ایمان بالغیب چاہیے؟

جواب: انھوں نے ظاہری جسمِ پاک کی زیارت کی اور ایمان، غیبی صفات یعنی نبوت و رسالت پر لائے، جو معجزات سے محسوس نہیں ہوتے۔

سوال (۳): اس سے لازم کہ نبی علیہ السلام کو مومن نہ کہا جائے کہ اُن سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں جو غیب ہو؟

جواب: یہ ساری گفتگو مومنوں کے متعلق ہے، وہ تو عینِ ایمان ہیں، اُن کے جاننے، پہچاننے اور ماننے کا نام ہی ایمان ہے۔ سب مومن، وہ ایمان۔ سب عارف، وہ عرفان۔ سب صادق، وہ سراپا صدق۔ سب عالم، وہ عینِ علم۔ سب قاصد، وہ منزلِ مقصود۔ سب طالب، وہ مطلوب۔ وہ سب کی انتہا۔ انھیں اپنے پر قیاس نہیں کیا جائے گا، اُن کو مومن تو اس طرح کہہ دیتے ہیں جس طرح خدائے تعالیٰ کو۔

مسند امام احمد بن حنبل میں ہے کہ حارث بن قیس نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ افسوس ہے کہ ایک نعمت آپ کو ملی، مجھ کو نہ ملی، کہ تم یار کے دیدار سے مشرف ہوئے اور میں نہ ہوا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: نبوتِ مصطفیٰ علیہ السلام سب پر ظاہر ہے، لیکن اے حارث! تم ایمان میں کامل ہوئے کہ ہم دیکھ کر ایمان لائے اور تم بغیر دیکھے، اور یہی آیت پڑھی۔

ایک شخص سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ نے سرکار کو دیکھا ہے، فرمایا: ہاں۔ عرض کی، کلام سنا ہے۔ فرمایا: ہاں۔ پوچھا: بیعت کی ہے۔ فرمایا: ہاں۔ تو اس پر وجد طاری ہو گیا، غشی آ گئی، کہنے لگا: تم کیا ہی خوش نصیب ہو، تو آپ نے فرمایا: میں ایک حدیث سناتا ہوں۔ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مبارک ہے وہ جو مجھے دیکھ کر ایمان لایا۔ اور بڑا ہی مبارک ہے وہ جو بغیر دیکھے ایمان لایا۔

سوال: صحابہ پر اولیا پر سب ظاہر ہے غیب نہیں ہوا؟

جواب: ایک ہے دیکھ کر ایمان لانا اور ایک ہے ایمان لا کر دیکھنا، یہ حضرات غائب چیزوں پر ایمان لاتے تھے بعد میں نور ایمان کی زیادتی کی وجہ سے وہ غائب چیزیں ان پر ظاہر ہو گئیں، لہذا ان کو ایمان بالغیب کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوا۔ (تفسیر نعیمی ج ۱/ص ۱۲۷۔۱۲۸۔۱۲۹)

{وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ}

(اور نماز قائم رکھیں)

تعلق: ایمان کے بعد اعمال کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایمان اعمال پر کئی وجہوں سے مقدم ہے۔

(۱) ایمان اصل ہے، اعمال شاخیں۔

(۲) ایمان دل کا کام ہے جو بادشاہ ہے۔ اور اعمال رعایا کا کام ہے جو اعضاے بدن ہیں۔

(۳) ایمان سب پر فرض ہے۔ اعمال صرف مومن پر۔

(۴) ایمان ہمیشہ ساتھ رہے گا، مگر اعمال معینہ وقت تک ساتھ رہیں گے۔

(۵) ایمان سب نبیوں میں یکساں اور نماز میں تبدیلیاں۔

(۶) ایمان اول فرض، نماز بعد میں۔

☆ نماز کو زکات سے پہلے کیوں ذکر کیا گیا؟

(۱) نماز بدنی عبادت، زکاۃ مالی عبادت ہے، بدن مال سے افضل ہے۔

(۲) نماز پہلے فرض ہوئی، زکات بعد میں۔

(۳) نماز کا تحفہ عرش پر بلا کر دیا۔ زکات میں یہ بات نہیں۔

(۴) نماز دن بھر میں پانچ مرتبہ، زکات سال میں ایک مرتبہ۔

(۵) نماز امیر غریب سب پر فرض، زکات صرف مال دار پر فرض۔

''یُقِیْمُوْنَ '': ''اِقامۃ '' سے بنا ہے، معنی سیدھا کرنا، یہاں ہمیشہ پڑھنا اور اس کے ظاہری وباطنی آداب کے ساتھ پڑھنا مراد ہے۔ جو خیال نہ کرے، ہمیشہ نہ پڑھے، سستی سے پڑھے اس میں داخل نہیں۔ صوفیہ کے نزدیک نماز قائم کرنا اور ہے اور نماز قائم رکھنا اور ہے۔ بغیر بنیاد کے دیوار، بغیر جڑ کے درخت، بغیر شہد یا قوام کے بعض پھل قائم نہیں رہ سکتے۔ بنیادِ نماز پر پوری عمارتِ اسلام قائم ہے۔

نماز کی بنیاد عشقِ رسول علیہ السلام ہے۔ جمع کے صیغہ سے جماعت کی طرف اشارہ ہے۔

''صلاۃ '': ''صَلیٰ ''یا ''صَلْوٌ '' سے ہے۔ معنی آگ سے گرمی حاصل کرنا یعنی تاپنا ہے۔ ارشاد ہے: {لَعَلَّکُمْ تَصْطَلُوْنَ} [تاکہ تم تاپو۔ سورۂ نمل:۷] ۔ بانس کو گرما کر سیدھا کیا جاتا ہے۔ نماز سے ٹیڑھے آدمی کو سیدھا کرتے ہیں۔

دوسرا معنی لازم پکڑنا۔ ارشاد ہے: {تَصْلٰی نارا حامیۃ} [سورۂ غاشیہ:۴] چوں کہ نماز بھی مسلمان کے لیے لازم ہے اس لیے اس کو صلاۃ کہتے ہیں۔

''صلاۃ ''قرآن میں پانچ معنوں میں آیا ہے۔

(۱) دعا: {وَصَلِّ عَلَیْھِمْ} [سورۂ توبہ:۱۰۳]

(۲) تعریف: {یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ} [سورۂ احزاب:۵۶]

(۳) تلاوت: {وَلَا تَجْھَرْ بِصَلٰوتِکَ} [سورۂ اسراء:۱۱۰]

(۴) رحمت: {صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ} [سورۂ بقرہ:۱۵۷]

(۵) نماز: {یُقِیْمُوْنَ الصلوۃَ} [سورۂ بقرۃ:۳] (تفسیر نعیمی ص ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱)

فضائل: (۱) نماز تمام ملائکہ کی عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ تاکہ پابندِ نماز ملائکہ کے برابر ہو یا افضل۔

(۲) نماز ساری مخلوقات، جمادات، نباتات، حیوانات کی عبادتوں کا مجموعہ ہے۔

(۳) نماز انسان کی ہر حالت درست کرتی ہے۔ برائیوں سے بچاتی ہے۔

(۴) نماز صدہا بیماریوں کا علاج ہے۔

(۵) نماز ہر مصیبت کا علاج ہے۔ جیسے نمازِ کسوف، خسوف، استسقا، حاجت وغیرہ۔

نماز کیسے پڑھیں: حاتم اصم نماز کس طرح پڑھتے تھے؟

اچھی طرح وضو، سیدھا قبلہ رو کھڑا ہونا، مقام ابراہیم سینہ کے سامنے ہونا، اللہ میرے پاس، میرا قدم پل صراط پر، مَلَک الموت پیچھے، یہ میری آخری نماز۔ ایک ایک لفظ کے معنی پر غور کرتا ہوں، عاجزی سے رکوع، گریہ وزاری سے سجدہ، امید قبول پر التحیات، اور سنت کے طریقے پر سلام۔ پھر بعدِ فراغتِ نماز، قبول کی امید اور رد کے خوف میں مشغول ہوتا ہوں۔ اسی طرح تیس سال سے پڑھتا ہوں۔

صوفیہ کرام فرماتے ہیں: اے اللہ کے بندو! نماز کے لیے تارے بن جاؤ کہ تمام رات رب کی عبادت کرو اور یہ نہ ہو سکے تو چاند بن جاؤ یعنی رات کے بعض حصے میں عبادت کرو، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم سورج بنے رہو، دن غفلت میں نہ گزارو۔

اسرار اور حکمتیں: نمازیں پہلے پچاس فرض ہوئیں، پھر پانچ فرض رہیں، لیکن ثواب وہی رہا یعنی ایک نماز پر دس گنا ثواب۔

☆ نماز مختلف امتوں نے پڑھیں، سب مل کر پانچ ہی ہوتی ہیں۔

☆ نماز سے مقصود ہے کہ انسان ہر حالت کو ذکرِ الٰہی سے شروع کرے۔ اب دن رات میں پانچ ہی حالت ہے، صبح، دوپہر، عصر، شام، نیند۔

☆ نمازوں کی رکعتیں انبیا کی یادگار کی وجہ سے مختلف ہوئیں۔ فرشتوں کے بازو مختلف ہیں، نماز کی رکعتیں روح کے لیے گلا اور بازو ہیں۔

☆ کعبہ کو منہ کرنا اس لیے ہے کہ کعبہ تمام زمین کی اصل ہے، لہٰذا جسم اصل کی طرف

رہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ روح کی اصل محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف رہے۔ اسی لیے نمازی نماز میں آپ کو سلام کرتا ہے۔ (تفسیر نعیمی ج۱/ص ۱۳۲۔ ۱۳۳)

سوال: جب متقی وہ ہے جو نماز پڑھے تو وہ صحابہ جو نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا گئے یا جو نومسلم وقت پائے بغیر مرجائے متقی نہ ہوا؟

جواب: ہر عبادت میں قدرت شرط ہے، مطابقِ طاقت واجب ہوتی ہے، جو نماز پڑھنے کا موقع نہ پائے اس پر نماز فرض نہیں۔

مال دار پانچ ارکان ادا کرتا ہے، غریب صرف تین، حائضہ نماز بھی نہیں پڑھتی، مگر یہ سب ایک درجہ کے متقی ہیں۔ ایک کی عمر سو سال کی، ایک کی پچیس برس کی، دونوں ایک درجہ کے ہیں۔

نیز ایک ہے ماننا اور ایک ہے کرنا، کرنے کا موقع نہ ملا۔ متقی وہ ہے جو موقع ملے تو کرے اور اگر نہ ملے تو کم از کم مانے۔

سنت اور حدیث میں فرق:

(۱) حدیث حکایت ہے۔ اور سنت وہ ہے جس کی حکایت کی جائے۔ جن لفظوں میں عاداتِ کریمہ نقل و بیان کی گئیں، وہ حدیث ہے۔ اور حضور علیہ السلام نے جن کو کیا وہ سنت ہیں۔

(۲) سرکار علیہ السلام کے تمام طریقے جو نقل کیے جائیں وہ ہمارے لیے قابل عمل ہوں یا نہ ہوں، سب حدیث ہے۔ اور جو قابلِ عمل ہوں، وہ سنت۔

اس لیے حدیث عام اور سنت خاص ہے، حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے خصائص جیسے: نو بیویاں ایک ساتھ نکاح میں رکھنا، روزۂ وصال، منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا اور اونٹ پر طواف کرنا یہ سب حدیث ہیں، لیکن ہم پیروی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ''عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي '' (تم پر میری سنت لازم ہے)۔ ''عَلَيْكُمْ بِحَدِيثِي '' (تم پر میری

حدیث لازم ہے) نہ فرمایا گیا، لہذا" اہلِ حدیث" نام ہی غلط ہے۔(تفسیر نعیمی ج ا ص ۱۳۳۔۱۳۴۔۱۳۵)

{وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ}

(اور ہماری دی ہوئی روزی سے ہماری راہ میں اٹھائیں)

تعلق: (۱) نماز کا جسم سے اور زکاۃ کا مال سے تعلق ہے۔ زکاۃ نماز کے بعد فرض ہوئی۔

(۲) ایمان میں نجات، نماز میں مناجات، خرچ میں درجات۔

(۳) ایمان میں بشارت، نماز میں کفارہ اور خرچ میں طہارت۔

(۴) ایمان میں عزت، نماز میں قربت اور خرچ میں زیادتی۔

(۵) تقوی، ایمان، نماز اور خرچ چاروں خلفا کی صفتیں ہیں۔ متقیوں کے سردار صدیق اکبر، مومنوں کے سردار فاروق اعظم، غنیوں کے بادشاہ عثمان غنی اور راہِ خدا میں خرچ کرنے والوں کے سردار حضرت علی رضی اللہ عنہم ہیں۔

{مِمَّا} کی اصل "مِنْ ما" ہے، "مِنْ" تبعیضیہ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ مال، حلال، حرام اور کھرے کھوٹے دونوں ہوتے ہیں۔ حلال خرچ کرو، کھرا خرچ کرو۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ کل خرچ کرکے گداگر نہ بن جانا۔

{رَزَقْنا}: "رِزْق" سے ہے۔ عطا کی ہوئی چیز۔ حصہ۔ اصطلاح میں ہر وہ چیز ہے جس سے جان دار نفع اٹھائے۔

اس میں زکاۃ، صدقہ فطر، نفلی صدقے، وقف، حج، جہاد اور اہلِ قرابت کا خرچ سب بیان ہوگیا۔

{یُنْفِقُوْنَ}: "اِنْفاق" سے ہے۔ بکھیرنا۔

جس کا دل زبان ایک نہ ہو منافق ہے۔ لومڑی کے سوراخ کو "نافقہ" کہتے ہیں۔ سکہ رائج الوقت کو "نافقہ" کہتے ہیں۔ (تفسیر نعیمی ص ۱۳۵۔۱۳۶۔۱۳۷)

تفسیر صوفیانہ: آیت کریمہ باطنی نعمتوں کے خرچ کو بھی شامل ہے، علما اپنا علم، غنی اپنا مال، عابدین اپنی جان، زاہدین اپنی جان خرچ کریں۔ دنیا کی آلودگیوں سے پاک رکھیں۔ دنیا کی مصیبتوں کو اس طرح دور رکھیں جیسے کشتی سے پانی۔

زکات کے اسرار: یہ قدرتی بات ہے کہ خرچ کرنے سے چیز بڑھتی ہے، جیسے عالم کا علم، کنویں کا پانی اور درخت کی شاخیں۔ زکاۃ نہ دینے سے ترقی رک جائے گی۔

قدرت نے ہر چیز سے زکاۃ لی ہے۔ بیماری تندرستی کی زکاۃ ہے، نیند بیداری کی زکاۃ ہے۔ تکلیفیں راحتوں کی زکاۃ ہیں۔ کچھ غلہ برباد ہو جانا پیداوار کی زکاۃ ہے، وغیرہ۔

اگر کوئی چیز ضرورت سے زائد ہو تو اس میں دوسروں کا حصہ ہے۔

زائد کا علاحدہ کرنا ضروری ہے، فضلہ وغیرہ رُکنے سے بیماری ہو جاتی ہے۔ حکومت راحت رسانی کے لیے ٹیکس لیتی ہے، اگر ادا نہ کریں تو باغی قرار پائیں۔ رب نے ہمارے آرام کے لیے سب کچھ بنایا ہے۔

محبتیں کئی ہوتی ہیں۔ مفید، غیر مفید۔ خدا اور سول کی محبت مفید، دنیا کی محبت غیر مفید، شیطانی چیزوں سے محبت نقصان دہ ہے۔ پہلی کو عبادات سے بڑھایا اور زکاۃ دلا کر دنیا کی محبت گھٹائی۔ کسان کا غلہ جو بوے زیادہ ہو گا، جو رکھے رہے گا اتنا ہی رہے گا۔ (تفسیر نعیمی ج ا ص ۱۳۷۔۱۳۸)

{وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ}

(اور وہ کہ ایمان لائیں اس پر جو اے محبوب تمھاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں)

{ما اُنْزِلَ اِلَيْكَ} سے مراد ہر وہ چیز ہے جو آپ کی طرف اتاری گئی۔ مفاد یہ ہے کہ

متقی مومن وہ ہے کہ جو اُن سب چیزوں پر ایمان لائے جو آپ کی طرف آئیں۔ صرف قرآن سے ایمان نہیں ملے گا، ورنہ بالقرآن ہوتا۔ لہذا قرآن وحدیث سب پر ایمان لانا ضروری۔

ارشاد ہے: {وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡھَوٰی}[ہمارے محبوب ﷺ اپنی خواہش سے بولتے ہی نہیں] (تفسیر نعیمی ج ا ص ۱۴۱)

"اِلَیۡکَ" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو قلبِ مبارک پر بطور الہام نازل ہوئیں، جو جبرئیل علیہ السلام لائے، جو کان مبارک نے سنا اور جن چیزوں کو آنکھوں نے دیکھا خواہ فرش، خواہ عرش، سب کو شامل ہے، لہذا نماز، روزہ، زکاۃ، نماز کی رکعتیں، اور زکاۃ کا نصاب سب اس میں شامل ہیں اگرچہ بعض دیکھ کر، بعض سُن کر اور بعض قلب اطہر کے ذریعہ علم میں آئیں، سب کا ماننا ضروری ہے۔ (تفسیر نعیمی ج ا / ۱۴۱)

{وَمَا اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ} سے معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن کو ماننا ضروری ہے، اسی طرح تمام آسمانی کتابوں کا ماننا ضروری ہے۔

(۱) قرآن کا ماننا بھی ضروری اور محکم آیتوں پر عمل بھی ضروری۔ دوسری کتابوں کا فقط ماننا ضروری ہے، اُن پر عمل ہمارے ذمہ لازم نہیں۔

(۲) اُن کتابوں کا تفصیل سے جاننا ضروری نہیں، قرآن میں بقدر ضرورت احکام کی تفصیل جاننا فرض ہے، ضروری ہے، پورے قرآن کی تفصیل جاننا فرض کفایہ ہے جو علما ادا کرتے ہیں۔

ان فرقوں کی وجہ سے "مَا اُنۡزِلَ" کو دوبارہ فرمایا گیا، قرآن کے لیے الگ، اور دوسری کتابوں کے لیے الگ۔

نکتہ: منسوخ احکام کا ماننا ضروری ہے، اور عمل کرنا اکثر منع ہے۔ جیسے بیت المقدس کا قبلہ ہونا، اسی لیے یہاں صرف ایمان کا ذکر ہوا، عمل کا نہ ہوا۔

{وَبِالۡاٰخِرَۃِ} ہمیں تین جگہ رہنا ہے، دنیا، قبر اور ہمیشہ آخرت میں۔ "دنیا": "دُنُو"

(بمعنی قرب) سے بنا ہے، کیوں کہ قریب کی چیز ہے، اس کی فنا قریب ہے۔ یا ”دناءت“ سے ہے، معنی: ادنی اور حقیر ہے۔ ”برزخ“ کا معنی پردہ ہے۔ نہ وہاں عمل، نہ کیے ہوئے کی جزا۔ وہ دنیوی زندگی اور اخروی زندگی میں پردہ ہے، اس لیے برزخ کہتے ہیں۔

”آخرۃ“ کا معنی دوسری چیز، چوں کہ وہ دوسری زندگی ہے۔ لغوی معنی میں برزخ بھی شامل ہے۔ اس دنیا کے علاوہ جو کچھ ہے سب پر ایمان لانا ”ایمان بالغیب“ ہے، چوں کہ دنیا ظاہر ہے، اس لیے غیب کا ذکر ہے، ظاہر کا نہیں۔

{هُمْ يُوْقِنُوْنَ} یہاں ”ھم“ کا بڑھنا انحصار کے لیے ہے یعنی وہی لوگ یقین رکھتے ہیں، چوں کہ آریہ، عیسائی اور یہودی قیامت کو نہیں مانتے اور نہ قیامت کے بعد کے حالات کو، یا غلط طریقہ سے مانتے ہیں اس لیے یہ حصر صحیح ہے۔ جو نہ مانے وہ کافر اور مرتد ہے۔

”یُوْقِنُون“: ”الیقین“ سے ہے، اس کے دو معنی ہیں:

(۱) کسی ایک چیز کو بلا شبہہ جاننا، یعنی پہلے شبہہ ہو اور بعد میں نہ رہے۔

(۲) دلائل سے بلا شبہہ جاننا۔ اسی لیے حق تعالی کے علم کو یقین نہیں کہتے، کیوں کہ اس کا علم نہ دلائل سے ہے، نہ شک و شبہہ کے بعد؛ نبی ﷺ کے اپنے علمِ نبوت کو بھی یقین نہیں کہتے، کہ شک نہ ہوا۔

شریعت میں یقینِ خبر ہی معتبر ہے، لہذا جو نبوت کا انکار کرے کافر ہے۔

یقین و ایمان تین طرح کے ہیں: (۱) علم الیقین، جیسے سُن کر آگ کی گرمی جاننا۔ (۲) عین الیقین، جیسے آگ کے پاس بیٹھ کر آگ کی گرمی جاننا۔ (۳) حق الیقین، جیسے، آگ میں جل کر جاننا۔

مَن تُو شدم تو مَن شدی مَن تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں مَن دیگرم تو دیگری

حق الیقین والا جس پر نظر کردے اس کو بھی رنگ دے، جیسے کوئلہ جب آگ بن جاتا

ہے تو جسم کوئلہ بنا رہتا ہے، لیکن کام آگ کا کرتا ہے۔ (تفسیر نعیمی ار ۱۴۳)

{أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ} [البقرۃ: ۵]

(وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہ ہی مراد کو پہنچنے والے)

تعلق: یہ قول یا تو ''الذین'' کی خبر ہے۔ یا الگ جملہ ہے، ''اولئک'' مبتدا، ''عَلٰی هُدًی اخیر تک ''اس کی خبر ہے۔

☆ یہ گزشتہ آیتوں کا نتیجہ ہے، پہلے عمل، اب انجام۔

☆ وہی لوگ ہدایت پر ہیں جو پچھلی آیتوں پر عامل ہیں۔

''اولئک'' :اسم اشارہ ہے، محسوس چیز کی طرف، یا ذہن میں مثلِ محسوس شے کی طرف اشارہ کے لیے ہے۔

اگر متقین سے جماعتِ صحابہ مراد ہے تو صدیق وفاروق وعثمان وعلی و حضرات انصار ومہاجرین رضوان اللہ علیہم سب ہدایت پر ہیں۔ اور اگر عام متقین مراد ہیں تو قیامت تک جن کی یہ صفت ہو وہ ہدایت پر ہیں۔

{علی ھدیً} ''علی ''اس لیے لایا گیا کہ غلبہ کے معنٰی میں ہے، جیسے زید سواری پر ہے، یعنی سواری زید کے قبضہ میں ہے، یعنی وہ لوگ ہدایت پر غالب ہیں، ہدایت اُن کی ہو چکی ہے۔ تادمِ اخیر چھوٹے گی نہیں، وہ اُ ن کے رب کا عطیہ ہے۔ نفس وشیطان، دنیوی تفکرات اور دیگر راحتیں اُن کو ہدایت سے دور نہیں کر سکتیں۔ وہ ان سب سے اس طرح گزر جاتے ہیں، جیسے دریا پر کشتی۔

''ھدی ''نکرہ ہے، یعنی: وہ اُن تمام ہدایتوں پر ہیں۔ وہ اس راستے پر چل رہے ہیں جو جہنم سے بچتا ہوا جنت سے گزرتا ہوا اللہ کے محبوبین سے ملاتا ہوا رب تک پہنچاتا ہے۔

''مِنْ رَّبِّھِم ''، یعنی: جو کچھ اُن کو ملا ہے اُ ن کے رب کے کرم سے ہے۔ سارے

اعمال اسباب ہیں، رب مسبب الاسباب۔ اس کے کرم سے اعمال ملے۔ اعمال پر قائم رہے۔ اعمال پر قائم رہیں گے۔ اعمال کو باطل کرنے والی چیزوں سے محفوظ رہے۔ اور انھیں جو مقبولیت ملی وہ سب اُس کے کرم سے ہے۔

''اولٰٓئِکَ'' دوبارہ لایا گیا، کہ پہلے دو صفتیں متقیوں کی بیان ہوئیں۔ (۱) ایمان بالغیب، اقامتِ صلاۃ، انفاق۔ (۲) دوسری آسمانی کتابوں پر ایمان۔ پہلی صفت کے لحاظ سے وہ ہدایت پر ہیں اور دوسری صفت کے لحاظ سے اُن کے لیے کامیابیاں ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی صفتیں عام مسلمانوں کی تھیں اور دوسری علمائے کرام کی۔ عام لوگ ہدایت پر ہیں۔ لیکن علمائے کرام کامیاب ہیں۔ جیسے ارشاد ہے: {قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی} [کامیاب وہ ہوا جس نے تزکیۂ نفس کیا۔ سورۂ اعلیٰ: ۱۴]

''ھُم'' سے معلوم ہوا کہ یہی لوگ کامیاب ہیں باقی سب خواب و سراب ہے۔

''مُفْلِحُوْنَ'': ''فلاح'' سے ہے، معنی: چیرنا، کھلنا، قطع کرنا۔ اسی لیے کسان کو ''فلّاح'' کہتے ہیں۔ کیوں کہ زمین چیرتا ہے۔ اصطلاح میں کامیابی کو کہتے ہیں؛ کیوں کہ وہ بھی آڑوں اور پردوں کو چیر کر مشکلات کو دفع کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اس قسم کے لوگ دنیا، برزخ اور حشر میں کامیاب ہیں۔

تفسیرِ صوفیانہ: ایک میدان جس میں جگہ جگہ کانٹا، انگارہ، غار، کھائی ہو، تو جو عقل مند سب سے بچتا، صاف جگہ قدم رکھتا، لالٹین سے کام لیتا ہوا چلا جا رہا ہے، ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا، منزل جلد پالے گا۔

دوسرا جس کے پاس روشنی نہیں، کہیں گر کر ہلاک ہوگا۔

تیسرا جس کے پاس روشنی تو ہے، آگ غار سے بچتا ہے، لیکن کانٹوں کا خیال نہیں کرتا ہے، وہ پہنچے گا، لیکن زخمی ہو کر اور دیر سے پہنچے گا۔

یہ دنیا میدان ہے، کفر آگ، شرک غار، سنیما وغیرہ کانٹا۔ متقی کے پاس قرآن کا گیس

ہے۔اول درجہ کا کامیاب ہے۔عام مسلمانوں کے پاس گیس ہے، لیکن کانٹوں سے نہیں بچ پا تے۔ کافر کفر کی آگ میں جل کر ختم ہوگا، مشرک غار میں گر کر ختم ہوگا۔ متقی ہدایت پر ہیں اور اعلیٰ درجہ کامیاب ہیں۔ مسلمان ہدایت پر تو ہے لیکن دوسرے درجہ کا کامیاب۔اور کافر ومشرک نہ ہدایت پر نہ کامیاب۔

کامیابی کے تین انجام ہیں:

(۱) نفس، شیطان اور بُرے یار پر غالب رہنا۔

(۲) کفروگمرہی وجہالت اور نفس کے دھوکے اور شیطانی وسوسوں، قبر کی وحشتوں، قیامت کی دہشتوں سے نجات پاجانا۔

(۳) ابدی ملک، سرمدی نعمت، لازوال رحمت، دائمی سرور اور بے حجاب محبوب کو پالینا۔

شریعت میں اپنے آپ جانا ہوتا ہے۔ طریقت میں کسی اور طرف سے کشش ہوتی ہے۔ ''ہدیٰ'' سے مراد شریعت پر چلنا ہے اور ''فلاح'' سے مراد رب کا اپنی طرف کھینچنا ہے۔[تفسیر نعیمی ا/۱۴۶۔۱۴۷]

سوال: اس آیت سے معلوم ہوا کہ چھ صفتیں جن میں نہ ہوں وہ کامیاب نہیں، جیسے گنہگار مسلمان۔

جواب: کچھ اصلی ہیں جن کے بغیر یکسر کامیابی نہیں، جیسے '' ایمان بالغیب ''۔ اور کچھ فرعی ہیں، جیسے اعمال وغیرہ۔ جو اصل کا منکر ہو، یکسر ناکام ہے، جو فرع میں سستی کرے، وہ ناقص کامیاب ہے۔ جو سب مانے اور کرے، وہ کامل ومکمل، کامیاب اور متقی ہے۔

سوال (آریوں کا): یہ خدا کی بے جا طرف داری ہے، ہندو کرے تو قبول نہیں، مسلمان کرے تو قبول۔ ہندو کنواں کھودوائے ، خیرات کرے تو قبول نہیں اور مسلمان کا قبول، ایسا کیوں؟

جواب: ایک مال دار نے خوب اچھا حلوا بنایا اور اس میں تھوڑا سا سنکھیا زہر ملا دیا۔ اور ایک غریب نے معمولی لیکن زہر سے محفوظ بنوایا۔ یہی فرق ہے۔ کفر کا زہر سب بے کار کردے گا۔ مسلمان کے اعمال کفر کے زہر سے محفوظ ہیں۔

{اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ} [البقرۃ:۶]

(بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے، انھیں سب برابر ہے، تم انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے کے نہیں)

تعلق: (۱) گزشتہ آیت میں مقبول بندوں کا ذکر تھا، اُن کے مقابلے میں مردودوں کا ذکر ہے۔ ''تُعْرَفُ الْاَشْیاءُ بِاَضْدادِھا'' [چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں]

(۲) پہلے مقبولوں کی ان صفتوں کا ذکر ہوا، جن سے انھوں نے ہدایت و کامیابی پائی اور اب مردودوں کی ان صفتوں کا ذکر ہے جن کے سبب وہ محروم رہے۔

(۳) قرآن اُ ن لوگوں کے لیے ہدایت ہے جن میں چھ صفتیں ہوں، اُ ن کے لیے ہدایت نہیں جن میں آنے والی صفات ہوں۔ وہ ہدایت کی علتیں تھیں، اور یہ محرومی کی علتیں ہیں۔ قابل طبیب، مریض کو دوا بھی دیتا ہے اور پرہیز کی چیزیں بھی بتاتا ہے۔

شانِ نزول: ابولہب، ابوجہل وغیرہ کفار کے حق میں نازل ہوئی جو علمِ الٰہی میں ایمان سے محروم تھے۔ حضور ﷺ اُ ن کے ایمان نہ لانے سے غم گین ہوتے تھے، حق تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ غم گین نہ ہوں، آپ کی تبلیغ میں کوئی کوتاہی نہیں نہ ہمارے کلام میں نقصا ن ہے یہ خود ان کی بدنصیبی اور محرومی کی وجہ سے ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۴۹]

تفسیر: ''اِنَّ'' کا معنیٰ تحقیق، بے شک۔ یہ اس جگہ لایا جاتا ہے جہاں کوئی شخص کلام کا انکار کر رہا ہو۔ یا خود کلام ایسا اہم ہو جس کے انکار کا اندیشہ ہو۔ چوں کہ کلام اہم تھا، ناسمجھ لوگ انکار کرنے والے تھے۔

''الذین '' سے یاتوخاص لوگ مراد ہیں، جیسے ابو جہل، ابولہب اور ولید بن مغیرہ۔ یا عام کفار مراد ہیں جن کی ضد اور ہٹ دھرمی اُن کی طرح ہے۔

خیال رہے کہ قرآن پاک میں عبارت کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے، نہ کہ واقعۂ نزول کے خصوص کا۔ یعنی: اگرچہ یہ آیت خاص لوگوں کے لیے اتری، لیکن چوں کہ الفاظ عام ہیں، لہذا اس آیت سے وہ سب لوگ مراد ہوسکتے ہیں جو ازلی کافر ہوں۔

''کَفَروا '': ''کفر '' سے بنا ہے۔ معنی: چھپانا، ڈھکنا۔ اس لیے چھلکے کو ''کفور '' کہتے ہیں۔ ''کافور ''کو بھی کافور اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی بو تمام بوؤں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

شریعت میں، اللہ کے وجود، یا اس کی توحید، یا کسی نبی کی نبوت، یا ضروریاتِ دین کا انکار کردینا کفر ہے۔ دینی ضروریات وہ چیزیں ہیں، جن کو عام مسلمان جانتے ہوں کہ یہ دینی چیزیں ہیں۔ یا (یوں سمجھو کہ) جن کو مان کر مسلمان ہوتا ہے اس کا انکار کفر ہے۔

بعض کام جن کو شریعت نے دین کے انکار کا نشان قرار دیا ہے، جیسے زُنّار باندھنا، یا سر پر چوٹی (چُرکی) رکھنا کفر ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ کام جو کفار کا دینی نشان بن چکا ہو، جیسے چوٹی رکھنا، قشقہ لگانا کفر ہے۔ اور جو کام کفّار کے نشان ہوں، مسلمان کے لیے حرام ہیں، جیسے ہندوانی دھوتی پہننا، ہیٹ لگانا۔

قرآن میں کفر چار معنوں میں آیا ہے۔ (۱) ایمان کا مقابل۔ (۲) انکار۔ (۳) شکر کے مقابل، یعنی: ناشکری کرنا، ارشاد ہے: {وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ} [اور میرا حق مانو، میری ناشکری نہ کرو۔ سورۂ بقرہ:۱۵۲]۔ (۴) بیزاری، جیسے: {يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ} [سورۂ عنکبوت:۲۵]

کفر چار قسم کا ہے:

(۱) کفرِ انکار، وہ یہ کہ حق تعالی کو جانے ہی نہیں، جیسے رب سے بے خبر کفار۔

(۲) کفرِ جحود، وہ یہ کہ رب کو دل سے جانے، زبان سے اقرار واعتراف نہ کرے، جیسے: ابلیس اور ضدّی کافروں کا کفر۔

(۳) کفرِ عناد، دل سے جانے، کبھی زبان سے بول دے، لیکن کسی وجہ سے اطاعت نہ کرے، جیسے: ابوطالب کا کفر۔ ان کا شعر ہے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِیْنَ محمّدٍ
مِنْ خَیْرِ أَدْیانِ البَرِیَّۃِ دِیْنا

(مجھے بالیقین معلوم ہے کہ محمد ﷺ کا دین، ادیانِ مخلوق میں سب سے بہتر دین ہے)
[تفسیر نعیمی ۱/۱۵۰]

اور جیسے آج کل کے ہندو جو نعتیں لکھتے ہیں اور ان میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں۔

(۴) کفرِ نفاق، زبان سے اقرار کرے، لیکن دل سے اعتقاد نہ رکھے۔ آیت میں دوسری قسم کا کفر مراد ہے۔

☆ ضد کا علاج کسی عالم کے پاس نہیں۔ اور وہم کی دوا کسی حکیم کے پاس نہیں۔

ضد کی چند وجہیں ہیں:

(۱) رہبر کی ذات سے عناد ہو، اس کی ہر بات کا انکار کرے گا، جیسے: ابلیس، آدم علیہ السلام کے حسد وعناد سے کافر ہوا، سجدہ کا حکم سُن کر دیکھ کر بھی سجدہ نہ کیا۔ کیوں کہ کلام کا اثر، متکلّم کی عظمت سے ہوتا ہے۔ عشقِ مصطفی دل میں کفر آنے نہیں دیتا اور عداوتِ مصطفی دل میں ایمان آنے نہیں دیتی۔

(۲) باپ داداؤں کے طریقہ کی بے جا حمایت ہو۔

(۳) خود فرمان سے ضد ہو۔ یہ سب ضدی محروم ہیں۔

{سَوَاءٌ}: "اِستواء" سے بنا ہے، برابر ہونا، یہاں یہ مصدر راسمِ فاعل کے معنی

میں ہے، یعنی: برابر۔ {سواء عَلَیہِ م} یعنی: ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، ان کے لیے برابر ہے، ایمان نہیں لائیں گے۔ لیکن آپ کے لیے برابر نہیں، آپ تبلیغ جاری رکھیں، ثواب پائیں گے۔ اسی لیے آپ نے آخر دم تک تبلیغ فرمائی۔ مایوس مریض کو ڈاکٹر آخری دم تک دوا دیتا ہے اور فیس پاتا ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۱]

{ءَاَنْذَرْتَهُمْ} : ''اِنذار'' سے بنا ہے، خطرناک چیز کی اطلاع۔ شریعت میں عذابِ الٰہی سے ڈرانے کو ''انذار'' کہتے ہیں۔

نبی ڈراتے بھی ہیں اور خوش خبریاں بھی دیتے ہیں، لیکن یہاں پر چوں کہ علمِ الٰہی میں اُن کا ایمان نہ لانا مقدور ہو چکا تھا اور انسان ڈر سے اطاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے، حجت وہاں کام آتی ہے جہاں بات کام نہیں آتی۔ جب ڈرانا ہی مفید نہ ہوا تو بشارت کیا فائدہ دے گی۔ ڈرانا مقدم، بشارت بعد میں، جب پہلی کلاس ہی سے نہیں نکلے تو دوسری میں کہاں رسائی ہو گی۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۱]

{لَا یُؤْمِنُوْنَ} اس میں غیب کی خبر ہے جو بالکل سچی ہوئی، آخر کار وہ لوگ ایمان نہیں لائے۔ یہ کہا گیا کہ ایمان نہ لائیں گے، نہ یہ کہ قدرت نہیں رکھتے، لہٰذا اُن کا یہ کفر اختیاری ہے، وہ اس میں مجبور نہیں۔

تفسیرِ صوفیانہ: اس آیت میں بتایا گیا کہ جنھوں نے میثاق میں ''بلیٰ'' کہکر اقرار کیا، لیکن اپنے دل کے صاف آئینے کو اعمالِ بد سے اس قدر خراب کر لیا کہ صفائی کے قابل نہ رہا۔ اور جنھوں نے اپنی نفیس روح کو قالب کے پنجرے میں بند کرنے کے بعد پانچوں حواس کے دروازوں کے ذریعہ اس دنیا کو ایسے دیکھا کہ وہ اپنے اصلی وطن کو بھول گیے اور نفس وشیطان کی صحبت میں روح کو ایسا مانوس کیا کہ وہ اس پرانے وطن کو بھول گئی، دوستوں کو دور کیا، وہ لوگ اس قابل نہ رہے کہ اُس وطن کو یاد کریں۔

صوفیہ فرماتے ہیں: انسان ''اُنس'' سے بنا ہے، چوں کہ انسان ہر انیس ساتھی کا

اثر بہت جلد قبول کرتا ہے، اچھے ہوں گے تو اچھا، برے ہوں تو برا۔ انسانوں کو "ناس" (بھولنے والا) بھی کہتے ہیں، یہ بھی شیطان کی صحبت اور دنیا کے میدان میں آکر خدا کو بھول جاتا ہے۔

روح دو چیزوں کو دیکھتی ہے۔ ایک تو دنیا کو دوسرے آخرت کو، دنیا کو دیکھنا آنکھ، ناک اور کان وغیرہ روزنوں کے ذریعے سے اور آخرت کا خفیہ روزنوں سے۔ دنیا میں ہمیشہ مصروف رہنا آخرت کے روزنوں کو بند کردیتا ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۱]

سوال: جب حق تعالی کے علم میں یہ بات ہے کہ ایمان نہ لائیں گے تو تبلیغ سے کیا فائدہ؟

جواب: تبلیغ کے دو فائدے ہیں، ایک مبلغ کو، دوسرا جس کو تبلیغ کرے۔ ایک مفقود، دوسرا موجود، یعنی: مبلغ کا ثواب موجود ہے۔ اس تبلیغ کی وجہ سے حشر میں کفار کا منہ بند ہوگا۔

سوال: جب رب کو علم تھا کہ ایمان نہ لائیں گے تو ہلاک کیوں نہ کردیا جیسے قوم نوح علیہ السلام کے ساتھ ہوا؟

جواب: اس لیے کہ حضور رحمتِ عالم ہیں، عام عذاب نہ ہوگا۔ پہلے جلال کا ظہور تھا، اب امن کا دور دورہ ہے، ارشاد ہے: {مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ} [اور اللہ کا کام نہیں کہ انھیں عذاب کرے جب تک اے محبوب! تم اُن میں تشریف فرما ہو۔ سورۂ انفال: ۳۳]

سوال: جب کہ اُن کی تقدیر میں آچکا ہے کہ ایمان نہ لائیں گے تو سزا نہ ملنی چاہیے؟

جواب: سائل نے تقدیر کی حقیقت کو نہ سمجھا، تقدیر علمِ الٰہی کا نام ہے، اس علم میں جیسے مجرم کا جرم داخل ہے، ویسے اس کے اختیارات بھی، علم میں یہ آیا کہ اُس شخص کو ایمان لانے اور نہ لانے کا اختیار تو ہوگا، لیکن اپنی خوشی سے نہ لائے گا، جب یہ کفر اختیاری ہوا تو اُس کو سزا ضرور ملنی چاہیے۔

سوال: جب خدا نے اُن کے کافر ہونے کی خبر دی ہے تو اُن کا مومن ہونا ناممکن ہوگیا، کیوں کہ خدا کی خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی، تو ضروری ہوا کہ عذاب نہ ہو؟

جواب: جس طرح خدا کے جان لینے سے وہ کفر پر مجبور نہ ہوئے، اسی طرح خبر دینے سے بھی وہ کفر پر مجبور نہ ہوں گے، کیوں کہ خبر یہ دی گئی کہ وہ بخوشی کافر رہیں گے، اس خبر سے اُن کا ارادہ سے کافر رہنا ضروری ہوا اور اس ارادہ کی وجہ سے وہ مختار رہے۔

یہ خبر ایسی ہی ہے، جیسے قابل طبیب کسی مریض کو بتادے کہ تمھاری بیماری چوتھے درجہ تک پہنچ چکی ہے، جس کا علاج ناممکن ہے، مطلب یہ ہوا کہ تم نے بدپرہیزی سے اپنی بیماری اتنی بڑھادی ہے کہ اب وہ قابلِ علاج نہ رہی، قصور بیمار ہی کا ہوگا۔ نہ کہ طبیب کا۔

اسی طرح کفر کو کافروں نے اس حد تک بڑھادیا ہے کہ وہ اس قدر مضبوط ہوچکا ہے کہ اس کا نکلنا ممکن نہیں ہے، تو کفر کا اتنا قوی ہونا بھی اُن کی اپنی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کسی کی مخالفت ادنی ہوتی ہے، بڑھتے بڑھتے عناد کے درجہ تک پہنچادیتی ہے۔

{خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ٘ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ}

(اللہ نے اُن کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کردی اور اُن کی آنکھوں پر گھٹاٹوپ ہے اور اُن کے لیے بڑا عذاب)

تعلق: (۱) پہلے کفار کے صفات وحالات کا تذکرہ ہوا، یہاں اس کی وجہ بیان ہوئی۔

(۲) پہلے صفاتِ کفر کا ذکر ہوا یہاں اس کا انجام۔

(۳) پہلے اُن کی بیماری کا ذکر تھا یہاں اس کی وجہ بتائی گئی۔

(۴) پہلے بیماری کا ذکر تھا اور اب نتیجے کا۔

تفسیر: "ختم" کا معنی چھپانا، مضبوط کرنا، انتہا کو پہنچنا۔ مہر لگانے کو "ختم" اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اندر کی چیز لوگوں کی نگاہوں سے چھپادی جاتی ہے، مثلاً، کسی شخص نے کسی چیز کا پارسل کیا تو اس کو تھیلے میں بھر کر اس پر لاکھ وغیرہ کی مہر لگادی جس سے کہ

کوئی اس کو راستے میں کھول نہ سکے، یہاں ختم سے مراد مہر لگانا ہے اور دل پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ کفر اور گناہوں کو اچھا سمجھنے لگے اور اطاعت و فرمان برداری کو برا، کافر سرداروں سے دوستی اور انبیا و اولیا سے دشمنی کرنے لگے۔ اب اُن کے دلوں کا حال ایسا ہو گیا کہ نہ اُن سے کفر نکل سکتا ہے اور نہ ان تک حق جا سکتا ہے، جیسے مہر والا پارسل، کہ نہ کچھ گھسا سکتے ہو اور نہ ہی کچھ نکال سکتے ہو۔ "ختم" سے اسی حالت کو بیان کیا گیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

{طَبَعَ اللّٰہُ علیٰ قُلُوْبِھِم}[سورۂ توبہ:۹۳] "طبع" معنی چھاپنا ہے۔

دوسری جگہ اسی کو "اِغفال" فرمایا:

{اَغْفَلْنَا قَلْبَہ}[سورۂ کہف:۲۸] یعنی: غافل کرنا۔

تیسری جگہ "اِقساء" بمعنی سخت کرنا۔

چوتھی جگہ "رَین" {رَانَ علیٰ قُلُوْبِھِم}[سورۂ مطففین:۱۴] معنی قریب ہے۔[تفسیر نعیمی ا/ ۱۵۴]

{علیٰ قُلُوْبِھِم} "قُلُوْب": قَلْب کی جمع ہے، معنی: اُلٹا ہونا، بدلنا۔ کھوٹے سکے کو "قلب" کہتے ہیں، ہر شخص بدلتا ہے، اُلٹا واپس کرتا ہے۔ دل کو بھی اس لیے "قلب" کہتے ہیں کہ بائیں پہلو میں الٹا لٹکا ہوا ہے اور ہر وقت اُس کی حالت بدلتی رہتی ہے، کبھی متقی، کبھی گنہ گار، کبھی خوش، کبھی غمگین۔

ہماری زبان میں تو قلب گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو غنچہ (یعنی کلی) کی شکل میں ہے۔ روح اسی گوشت میں پیدا ہوتی ہے، رگوں کے ذریعہ پورے عضو میں پہنچ جاتی ہے۔ یہی ہر جان دار کی زندگی کی اصل ہے۔ شریعت میں اس ربانی لطیفہ کا نام ہے جس کا تعلق اسی گوشت سے ہے۔ اسی لطیفہ پر انسانیت موقوف ہے، اسی سے رب کی فرماں برداری، نافرمانی ہوتی

ہے۔ قرآن میں اکثر یہی معنی مراد ہیں، جس طرح جان اُس سے قائم ہے، اسی طرح اُسی سے ایمان قائم ہے۔ اسی پر الہام ہوتا ہے، یہی لطیفہ دلیلوں سے نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ کہیں ''قلب'' کہا ہے: {مَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ} [سورۂ ق: ۳۷] کہیں ''نفس'': {وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا} [سورۂ شمس: ۷] کہیں ''روح'': {قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ} [سورۂ اسراء: ۸۵] [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۵۴]

مولانا جامی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے: یہ غنچہ کی شکل کا دل نہیں، بلکہ طوطیِ دل کا پنجرہ ہے، اگر تو اِس پنجرہ اور طوطی میں فرق نہیں کرتا تو انسان نہیں۔

تو مطلب یہ ہے کہ اس دل پر اللہ کا بڑا فضل تھا کہ ہدایت پر رہنے اور رب کو پہچاننے کے لیے عطا فرمایا گیا تھا، جو ذوق و شوق اور کشف کا سرچشمہ تھا، جو کہ ایمان کے رہنے کی جگہ اور اُس کا برتن تھا، اب اس پر کفر کی مہر لگ گئی تو ایمان کی جگہ کہاں کہ ایمان لائیں گے؟ [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۵۴]

آنکھ کے لیے پردہ اور کان و دل کے لیے مہر زیادہ مناسب ہے، مہر ہر راستے کو بند کرتی ہے، اور پردہ صرف سامنے والے کو۔ کان ہر طرف کی آواز سنتا ہے، دل میں ہر طرح کے خیالات آتے ہیں، لہذا مہر لگا دو کہ تمام راستے بند ہو جائیں۔ آنکھ میں باہر سے کچھ نہیں آتا، بلکہ آنکھ کی شعاعیں بلند ہو کر باہر کی چیزوں پر پڑتی ہیں تو اُس کا احساس ہوتا ہے۔

''علی'' دوبارہ فرمایا گیا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ دل پر مستقل مہر لگی ہے، ایسا نہیں کہ دل کی وجہ سے کان بے کار ہیں۔

''سَمْع'' کا معنی سننا ہے، لیکن اس جگہ اُس عضو کو کہا گیا ہے جس میں یہ طاقت محفوظ ہے، دونوں کانوں کے اندر ایک پٹھا ہے جب آواز وہاں تک جاتی ہے تب اس کا احساس ہوتا ہے، چوں کہ وہ پٹھا ایک ہی ہے اس لیے واحد کا صیغہ لایا گیا۔

دل ایمان اور کفر کا ظرف تھا اس کا ذکر پہلے ہوا۔ اور کان آنکھ راستے۔ کان سے حق

سُن کر اور آنکھ سے سرکار کو دیکھ کر، قرآن پڑھ کر، قدرت کی ندرت دیکھ کر ایمان لاتا ہے۔ دل بادشاہ ہے، یہ غلام وخادم ہیں۔

پھر کان چند وجوہ سے آنکھ سے افضل ہے:

(۱) کوئی پیغمبر سُننے سے مجبور نہ ہوا، لیکن بعض کو آنکھ کا مرض ہوا، جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام، شعیب علیہ السلام۔ سُننا پیغمبری کی شرط ہے۔

(۲) سُننے سے عقل کامل ہوتی ہے۔

(۳) آنکھ دیکھنے میں خارجی روشنی کی محتاج ہوتی ہے۔ نہ تاریکی میں کام کر سکے، نہ تیز روشنی میں دیکھ سکے، مگر سُننے میں یہ شرط نہیں۔

(۴) تبلیغ کان وزبان سے ہوتی ہے۔

{عَلٰی اَبْصَارِهِم غشاوة} یعنی: اُن کی آنکھوں پر پردے ہیں۔

''ابصار'': ''بصر'' کی جمع ہے۔ معنی: دیکھنا۔ لیکن یہاں مراد آنکھ ہے۔

''غِشاوة'' سے مراد وہ پردہ ہے جو لوگوں کو نظر نہ آئے، لیکن دیکھنے والے کے لیے رکاوٹ ہو، آڑ بن جائے۔

{وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيم} ''عذاب'': ''عذب'' سے ہے۔ معنی: روکنا۔ میٹھے پانی کو اس لیے ''عَذْب'' کہتے ہیں کہ پیاس کو روکتا ہے، سزا کو اس لیے ''عذاب'' کہتے ہیں کہ وہ جرم سے روکتی ہے۔ قرآن میں عذاب سزا کے لیے استعمال ہوا ہے۔

''عَظیم'': ''حقیر'' کا مقابل ہے۔ ''کبیر'': ''صغیر'' کی ضد ہے۔

''حقیر'': ہر طرح چھوٹا، ''عظیم'': ہر طرح بڑا۔ ''صغیر'': ایک لحاظ سے چھوٹا، ''کبیر'': ایک لحاظ سے بڑا۔ معنی یہ ہوئے اُن کے لیے ایسا عذاب ہے جو ہر طرح سے بڑا ہے، دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوں گے، قیدی بنائے جائیں گے، آخرت میں

گرم آگ، زہریلے جانوروں اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

گناہوں کی اصل تین چیزیں ہیں: (۱) حرص (۲) حسد (۳) تکبر۔

غفلت پیدا کرنے والی چند چیزیں ہیں، زیادہ کھانا، زیادہ سونا، ہر طرح کے آرام کی خواہش، مال کی محبت، عزت کی رغبت، حکومت کی خواہش۔

بسا اوقات مال و حکومت کی طلب میں آدمی کافر بن جاتا ہے۔ گناہ دل میں سیاہی پیدا کرتا ہے،۔ تلاوت قرآن، موت کی یاد۔ رب کا ذکر دل کو صیقل کرتے ہیں، سیاہ قلب کے لیے ایک عرصہ چاہیے، ہاں اگر کسی کی نظر پڑ جائے تو پل بھر میں قلب کو صاف کر دیتی ہے۔

تو جو چاہے تو ابھی میل میرے دل کے دھلیں
کہ خدا دِل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

اور جس کی سیاہی اللہ والے سے بھی دور نہ ہو اُس پر مہر لگ چکی ہے

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

سیاہ دل آہستہ آہستہ عبادت سے ڈھل جاتا ہے، مگر نبی کی عداوت بیک وقت مہر لگا دیتی ہے، شیطان کے دل پر آدم علیہ السلام کی دشمنی نے مہر لگا دی، جادوگروں کا دل لمحہ بھر میں نگاہِ کلیمی سے صاف ہو گیا۔

صوفیانہ: رب نے "میثاق" کے دن انسانوں کو ذروں کی شکل میں ظاہر فرما کر اپنی ربوبیت کا اقرار لیا، پھر اُن ذروں کو دلوں میں، دلوں کو جسموں میں اور جسموں کو دنیا میں امانت رکھا، بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، ماں باپ مجوسی، عیسائی یہودی بنا دیتے ہیں۔ جب ہوش سنبھالا تو آہستہ آہستہ بُری صحبتوں سے روزن بند ہو گئے، یہاں تک کہ کُھل جانے کے قابل نہ رہے۔ بصارت رہی، بصیرت ختم ہو گئی۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۷]

ایک بزرگ نے کہا: جو مجھے دیکھ لے گا، جنتی ہو جائے گا، اعتراض ہوا کہ ابو جہل نے

نبی کو دیکھا اور ایمان نہ لایا؟ جواب دیا، قسم خدا کی ابو جہل نے محمد رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا، محمد بن عبد اللہ کو دیکھا، کیوں کہ سرکار علیہ السلام کو دیکھنے والی آنکھ جنتی ہے، وہ کبھی جہنم میں نہیں جاسکتی۔

حقیقت ہے کہ حسنِ لیلی کے لیے دیدۂ مجنوں چاہیے۔ جمالِ مصطفوی کے لیے نگاہِ صدیقی چاہیے۔ ارشاد ہے: {وَتَرَاهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ} [اے محبوب! وہ آپ کو دیکھتے تو ہیں پر دیکھتے نہیں۔ سورۂ اعراف: ۱۹۸] [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۷]

جس طرح بیج چھپایا جاتا ہے، پھر وہ درخت، شاخ اور پھل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، پھل بیج کے اندرونی و بیرونی رازوں کا مظہر ہے۔ تو گویا پھل بیج کے ظہور کا خاتمہ ہے۔ اسی طرح تقدیرِ الٰہی کا راز نیک بختی و بدبختی ہے جو اللہ کے علم میں محفوظ ہے، انسان کا وجود درخت کی طرح ہے جس میں نیک بختی و بدبختی محفوظ ہے جس سے اخلاق کی شاخیں نکلیں، شاخوں میں نیک و بد اعمال اور اقرار و انکار کے پھل لگے، ان پھلوں نے اسرارِ الٰہیہ ظاہر فرمادیا تو یہ دل اور کانوں کی مہر اور آنکھوں کا پردہ اُن بھیدوں کا مظہر ہے۔

فائدہ: بزرگوں کی عداوت سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ اور اُن سے دشمنی کے نتیجہ میں دل پر مہر لگ جاتی ہے، پھر اُس کو ایمان میسر نہیں ہوتا۔ اسی لیے حدیث قدسی ہے: ”جو میرے ولی سے عداوت رکھے اس کے لیے اعلانِ جنگ کرتا ہوں“۔ [بخاری شریف ۲/۹۶۳]

{وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ}

(اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور وہ ایمان والے نہیں)

تعلق: (۱) پہلے خالص مومنوں اور خالص کافروں کا ذکر ہوا، اب اُن منافقوں کا ذکر ہے، جو دل سے کافر اور زبان سے مسلمان بنتے ہیں۔

(۲) اس سے پہلے کھلے کافروں کا ذکر تھا اب چھپے ہوئے کافروں کا۔

شانِ نزول: مدینہ منورہ میں ایک شخص عبداللہ بن ابی تھا، اس کو اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، بعد ظہورِ اسلام وہ چالاکی سے ایمان لایا، کلمہ پڑھا، لیکن اس کی سرداری کا تاج اسلام کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا، لہذا وہ مسلمانوں کے خلاف سازش میں لگا رہتا تھا، مسلمانوں میں سرکار کی تعریف، کافروں میں "اِنّا مَعَکُم" (بالیقین ہم تمھارے ساتھ ہیں) کہتا۔ اور خوش ہوتا کہ ہم دونوں جماعتوں کے پیارے ہیں۔ بہت سارے لوگ اس کے ساتھ تھے، اس کی جماعت ہوگئی، انھی منافقین کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۹]

تفسیر: مسلمانوں کے لیے چار آیتیں، کافروں کے لیے دو آیتیں نازل ہوئیں۔ اور منافقوں کے لیے تیرہ آیتوں میں عیوب اور نشانیاں بیان کی گئیں، یا اس لیے کہ چھپا کافر بہت خطرناک ہے، تاکہ اُن کی پہچان ہو جائے۔ یا اس لیے کہ مسلمانوں میں رہتے رہتے مخلص مومن بن جائیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۵۹]

{مِنَ النَّاس} "ناس" انسان کا اسمِ جمع ہے، یہ "نَسِی" سے بنا ہے، معنی: بھولنا، کیوں کہ یہ میثاق کو، خدا کی نعمتوں کو جلد ہی بھول جاتا ہے۔ یا یہ "اُنس" سے بنا ہے، معنی: دیکھنا، ظاہر ہونا، یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے اور ظاہری زمین پر چلتا ہے۔ "جن" چوں کہ چھپے ہوئے حصہ میں آباد ہیں اس لیے جن کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ "اُنس" بمعنی محبت سے بنا ہے۔

"مَنْ" واحد، تثنیہ اور جمع سب کے لیے آتا ہے۔ یہ لفظاً واحد اور معنیً جمع ہے، اسی لیے اس کی طرف واحد اور جمع کی ضمیریں لوٹائی گئی ہیں، "یقول" میں واحد اور "آمنّا"، "ھُم" اور "مُؤمِنِینَ" میں جمع ہے۔

دو چیزوں پر ایمان کا ذکر ہوا، اللہ اور آخرت پر۔ یہ دونوں ایمانیات کے کنارے ہیں،

منافقین سارے ایمانیات پر دعوائے ایمان رکھتے تھے۔ یا وہ پہلے اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے تھے، اُ ن کے قول میں فریب تھا، یہودیوں سے کہتے ہم تو پہلے سے ایمان رکھتے ہیں، آج کوئی نئی بات تو نہیں، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔

اُ ن کے اس قول کے دو پہلو ہوئے، مسلمانوں کو ایمان لانے کا فریب دینا اور اپنے ہم جنس کفار کو یہ باور کرانا کہ ہم نے اپنے اصلی عقیدہ کو بیان کیا۔ اس لیے ارشاد ہوا: {وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ} یعنی: وہ مومنوں کی جماعت ہی سے نہیں، یا وہ اصل مومن ہی نہیں ہیں۔

خلاصہ: آیت کریمہ میں منافقین کا کلام نقل کیا گیا کہ وہ بہ ظاہر کہتے تھے کہ ہم ایمان لائے اور مسلمان ہوئے، تاکہ مسلمانوں میں مل کر دنیاوی فائدے حاصل کریں اور اپنے ظاہرِ اسلام کو آڑ بنا کر ہر قسم کی سختی سے بچے رہیں۔ مگر چوں کہ یہ ایمان حقیقی نہ تھا اور خلوصِ دل سے انھیں میسر نہ تھا، فقط زبان سے دعوائے اسلام تھا اور یہ حق تعالیٰ کو پسند نہیں تھا، لہٰذا مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ یہ لوگ فریبی ہیں، مسلمان نہیں۔ اِن کے عیوب کو قرآن نے مختلف جگہ بیان فرمایا ہے۔ اور جو کچھ غزوات میں انھوں نے فتور برپا کیا وہ سب قرآن میں درج ہے۔

فائدے:

پہلا فائدہ: انسانوں میں چند گروہ ہوئے:

(۱) جو دل و زبان سے مسلمان ہوئے، اُن کو "مخلص" کہا جاتا ہے۔

(۲) جو ظاہر و باطن میں کافر ہیں۔ اُن کو "مجاہر" کہتے ہیں۔

(۳) جو دل سے کافر اور زبان سے مومن ہیں، اُن کو "منافق" کہتے ہیں۔ جو شخص دل سے مومن اور زبان سے کافر ہو اُس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) کسی سخت مجبوری کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو مخلص ہے۔

قرآن میں ہے:{اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ}[سوا اُس کے جو مجبور کیا جائے اور اُس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو۔ سورۂ نحل:۱۰۶] مگر ضروری ہے کہ مجبوری کے دور ہوتے ہی وہ ایمان کو ظاہر کردے، اگر بلا سخت مجبوری کے کفر ظاہر کرتا ہے تو وہ شرعاً مسلمان نہیں اور نہ ہی اس پر اسلامی احکام جاری ہوں گے۔ جیسے تجہیز وتکفین، ونماز جنازہ وغیرہ وغیرہ۔ بہت ممکن ہے کہ کبھی اُن کی نجات ہوجائے۔

حدیث شفاعت میں ہے: جنتیوں کو حکم ہوگا کہ جہنم سے اُن کو باہر لاؤ جن کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو، چناں چہ جنتی حکم پر عمل کریں گے، پھر رب فرمائے گا: ’’شُفَعاء‘‘ اپنی شفاعت سے بخشوالے گئے، اب میری باری ہے، ایک لپ بھر کر جہنمیوں کو نکالے گا، یہ وہ لوگ ہوں گے جو شرعاً کافر تھے اور دل میں مومن۔

’’مُنافق‘‘: ’’نِفاق‘‘ سے بنا ہے، معنی: علاحدہ ہونا۔ نفاق کی چند قسمیں ہیں:

(۱) زبان سے ایمان ظاہر کرے اور دل سے ایک دم منکر ہو۔

(۲) زبان سے ایمان ظاہر کرے اور دل سے ایک دم منکر نہ ہو، بلکہ مذبذب۔

(۳) زبان سے ایمان کا اقرار کرے اور دل سے تصدیق بھی ہو، لیکن دُنیا کی محبت غالب ہو، دنیوی مفاد، اسلام پر مقدم ہو، چند سکوں کے بدلے جو کافر جو چاہے کرالے۔

(۴) جو ایسا بے حیا نہ ہو، مگر اُس کا حال قال کے مطابق نہ ہو، زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے، اس کو ’’تقیہ‘‘ کہتے ہیں، جو کہ شیعہ مذہب کا بڑا اصولی مسئلہ ہے، اس قسم کا نفاق بھی منافقین کا حصہ تھا، اس کو معمولی سمجھ دار بھی برداشت نہیں کرے گا۔

حدیث میں بعض گناہوں کو بھی نفاق کہا گیا ہے۔

منافقین کی چند علامتیں: جھوٹ بولے، لڑائی میں گالیاں بکے، وعدہ پورا نہ کرے، امانت میں خیانت کرے۔

دوسرا فائدہ: جتنے فرقے ایمان کا دعوی کریں اور کفر کا اعتقاد رکھیں وہ خارج

از اسلام ہیں، اس لیے کہ محض دعوی کرنے سے ایمان حاصل نہیں ہوتا ہے۔

تیسرا فائدہ: "من الناس" کہا گیا، اشارہ ہے کہ یہ لوگ فقط صورۃً انسان ہیں، انسانی کمالات وصفات سے عاری ہیں، اس لیے ان کا ذکر کسی خوبی سے نہیں کیا جاتا، ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی آدمی ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی کو صرف بشر کہنے میں اس کے کمالات وفضائل کے انکار کا پہلو نظر آتا ہے، اس لیے قرآن میں جابجا انبیا کو بشر کہنے والوں کو کافر فرمایا گیا ہے، کیوں کہ یہ لفظ انبیا کی شان میں ادب سے دور اور کفار کا دستور ہے۔

چوتھا فائدہ: معلوم ہوا کہ کھلے کافر سے منافق کا فر چند وجوہ سے بد تر ہے۔

[۱] کافر فقط کافر ہے، منافق کافر بھی ہے دھوکے باز بھی۔

[۲] کافر فقط کافر ہے اور منافق خبثی۔

[۳] کافر فقط کافر، منافق کافر بھی اور جھوٹا بھی۔

[۴] کافر محض کافر، منافق کافر بھی ہے اور اسلام کا مذاق اڑاتا ہے۔

سوال: منافقین، خدائے تعالی اور آخرت پر ایمان رکھتے تھے تو قرآن نے ان کے ماننے کا کیوں انکار کیا؟

جواب: غلط طریقے سے مانتے تھے، خدا کو اولاد والا، قیامت کو اپنی نجات کا دن۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نبی کریم علیہ السلام کو مانے بغیر کسی چیز کو ماننا مفید نہیں۔

{يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ}

(فریب دیا چاہتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے مگر اپنی جانوں کو اور انھیں شعور نہیں)

تعلق: (۱) پہلے منافقین کی بے ایمانی کا ذکر تھا، اب اُن کے بُرے اعمال کا ذکر ہے۔

(۲) پہلے بیان ہوا کہ وہ اگرچہ ایمان ظاہر کرتے ہیں، لیکن مومن نہیں، اس آیت میں اس کے مقبول نہ ہونے کی وجہ بتائی گئی، کیوں کہ وہ خلوص سے نہ تھا، فریب کے لیے تھا۔ ایک ہی کلمہ کوئی پڑھ کر مومن بنتا ہے اور کوئی وہی پڑھ کر بہت زیادہ بے دین ہو جاتا ہے، نیت وخلوص کو بہت دخل ہے، مکھن نکلا ہوا دودھ اگرچہ دودھ کی شکل کا ہے، لیکن بازار میں کوئی قیمت نہیں۔ خلوص ونیت مکھن کے مانند ہے۔ محض اچھے اچھے الفاظ جو خلوص سے خالی ہوں کافی نہیں ہیں۔

تفسیر: {یُخٰدِعُوْنَ}: ''خدع'' سے ہے۔ معنیٰ: چھپانا۔ اسی لیے اندرونی کمرے کو ''مِخْدع'' کہتے ہیں، کیوں کہ چھپا رہتا ہے۔ گردن کی چھپی ہوئی رگ کو ''اَخْدَعَیْن'' کہتے ہیں۔ اصطلاح میں ''خدع'' کا معنیٰ دھوکا ہے، یعنی: بُرائی کو دل میں چھپا کر اچھائی ظاہر کرنا۔

{اللہ} اس سے مراد یا تو اللہ کی ذات ہے، تو مطلب ہوگا کہ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یا اس سے مراد حضور ﷺ ہیں، کیوں کہ بہت جگہ ''اللہ'' کا ذکر ہے اور سرکار کی ذات مراد ہے، تاکہ لوگوں کو آپ کی عظمت کا پتہ چل جائے کہ رب کے دربار میں کس قدر آپ کا درجہ ہے، اُن کی اطاعت رب کی اطاعت ہے اور اُن کی مخالفت رب کی مخالفت ہے۔ اُن کی بیعت رب کی بیعت۔ اُن کا ہاتھ رب کا ہاتھ۔ مطلب یہ ہوا کہ منافقین رب کو نہیں، محمد رسول اللہ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

{اَنْفُسَھم} ''اَنْفُس'': ''نفس'' کی جمع ہے، نفس کے چند معنیٰ ہیں: ذات، روح، دل، دل کے متعلقات، خون، پانی۔ یہاں پہلے معنیٰ مراد ہیں۔ یعنی: یہ منافقین در حقیقت اپنے کو دھوکا دیتے ہیں، کیوں کہ جو اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ کو اختیار کرے وہ بڑا بے وقوف ہے اور سخت دھوکے میں ہے۔ منافقین نے دین چھوڑ کر دنیا اختیار کی اور اسی پر خوش ہوئے، لیکن دنیا ہاتھ نہ آئی، بلکہ بد نصیبی، رسوائی اور ذلت نصیب ہوئی، اپنے کو دھوکا دیا۔

صحابۂ کرام نے فانی دنیا اور اُس کی نعمتوں پر لات ماری اور اللہ ورسول کو اختیار کیا تو دنیا

بھی لونڈی بن گئی، اُن کے قدموں میں آگئی، در حقیقت یہی لوگ کامیاب ہیں۔

{وَما یَشْعُرُون} "شعور" سے ہے۔ "شعور" حواس سے جاننے کو کہتے ہیں، اس لیے حواس کو مشاعر کہتے ہیں، "شَعر" بال کو کہتے ہیں اور جو لباس جسم سے مس کیے ہوئے ہے اس کو "شِعار" کہتے ہیں، منظوم کلام کو بھی اسی لیے "شعر" کہتے ہیں کہ اس کی بُرائی، بھلائی اور وزن کا درست ہونا حواس سے معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کم بختوں کے حواس بھی ایسے بگڑ گئے کہ یہ اس قدر ظاہر چیز کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہماری خفیہ مخالفتوں سے اشاعتِ اسلام میں کچھ فرق نہ آیا، بلکہ بڑھتا ہی چلا گیا اور مسلمانوں کو ہم پر بالکل اعتماد نہیں، مگر اُس پر بھی اپنی بری روش کو نہیں چھوڑتے، تو گویا یہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں، اینٹ پتھر ہیں، ورنہ جانور بھی محسوس کر لیتے ہیں۔

خلاصہ: منافقین جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے، اپنے گمان میں وہ اللہ و رسول اور مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں، حالاں کہ در حقیقت وہ اپنے کو دھوکا دیتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ علّام الغیوب ہے، اس کو کیسے کوئی فریب دے سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ اُس کے خلیفۂ اعظم ہیں اُن کو سب کچھ بتا دیا ہے، اُن کو شروع سے انجام و حقیقت کا علم ہے، کیوں کہ حدیثِ معراج میں ہے کہ سارے کفار و مومنین کو دیکھ کر آئے ہیں۔ صحابۂ کرام کو بھی رجسٹر دکھا دیے، جیسا کہ حدیثوں میں ہے کہ بڑے بڑے کفار کے ایمان کی خبر دی تو سچ ثابت ہوئی اور بڑے بڑے متقیوں کے جہنمی ہونے کی خبر دی تو کافر ہوئے، فرمایا: "حسن و حسین جنتی جوانوں کے سردار ہیں"۔ [جامع الترمذی ۲/۲۱۷] "فاطمہ خواتین کی سردار ہیں"۔ وہ تو جنتی، جہنمی سب کو پہچانتے ہیں، لہٰذا یہ منافق دھوکا نہیں دے سکتے۔

مسلمان نورِ ایمان سے مومن و کافر کو پہچانتے ہیں، حدیث میں ہے کہ "مومن کی ذہانت سے ڈرو، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے" [جامع الترمذی ۲/۱۴۵]، بلکہ اللہ والوں کے پاس بیٹھنے والے جانور بھی کافر و مومن میں تمیز رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت سفینہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کے ساتھ شیر کے واقعے اور ابولہب کے بیٹے عتبہ کے ساتھ شیر کے واقعے سے ظاہر ہے۔ لہذا وہ مسلمانوں کو بھی دھوکا نہیں دے سکتے، لیکن چوں کہ حضور نے مسلمانوں سے اُن کے منافقانہ عیب کو ظاہر نہ کیا اس لیے منافق سمجھے کہ ہم دھوکا دینے میں کامیاب ہیں اور حقیقتا نہ خدا کو، نہ رسول کو اور نہ مسلمانوں کو دھوکا ہوا، خود منافقوں کو دھوکا ہوا۔

اس بات کو انھوں نے نہ سمجھا کہ مسلمانوں کا خاموش ہو جانا در حقیقت عیب پوشی ہے جس میں ہزار ہا راز ہیں۔ آخر کار دنیا میں رسوا ہوئے اور آخرت میں سخت عذاب کے مستحق ہیں، لیکن چوں کہ ان کے حواس میں فرق آگیا اس کو نہ سمجھ سکے۔

تفسیر صوفیانہ: انسان کے پاس بھی یہ تینوں جماعتیں موجود ہیں، روحِ انسانی خالص مومن، شیطان کھلا ہوا کافر اور نفس امارہ منافق کہ دل سے مل کر اپنے کو اس کا دوست ظاہر کرتا ہے، اور پھر شیطان سے مل کر اس کا دوست بنتا ہے، لیکن جس دل پر اللہ کا کرم ہو جائے نفس امارہ غالب نہیں آپاتا، بلکہ مجبور ہو کر تابع بن جاتا ہے۔ [تفسیر نعیمی ا/ ۱۶۴]

{فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَہُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌۢ ۬ۙ بِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ}

(اُن کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے اُن کی بیماری اور بڑھائی اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے، بدلہ اُن کے جھوٹ کا)

تعلق: (۱) پہلے منافقوں کی بدعملی کا ذکر ہوا اب اس بدعملی کی وجہ بتائی جارہی ہے۔ یعنی یہ اس وجہ سے ہے کہ ان کے دل میں نِفاق کی بیماری ہے اور برابر بڑھ رہی ہے۔

(۲) پہلے بدعملی کا ذکر تھا اب اس کے نتیجے کا ذکر ہے۔ چوں کہ یہ ایسی حرکتیں کر رہے تھے، کہ شفا کی بجائے مرض بڑھتا گیا، جیسے طبیب کہے کہ مریض کا مرض بد پرہیزی سے بڑھتا گیا۔

"مرض": بدن کی اس حالت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے طبعی کاموں میں

خلل پڑ جائے، جیسے بخار، جسمِ انسانی کو طبعی کاموں سے روک دیتا ہے۔ لیکن مجازاً نفسانی عوارض کو بھی مرض کہتے ہیں جو نفس کے کمالات کو ختم کر دیں، جیسے: جہالت، بد عقیدگی، حسد، بغض، دنیا کی محبت، جھوٹ، ظلم وغیرہ، کہ ان کی وجہ سے نفس کے کمالات زائل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ عیوب کفر تک پہنچا دیتے ہیں، جو روحانی موت ہوتی ہے،

دل کی بیماریاں چند قسم کی ہیں:

(۱) وہ جن کا تعلق اخلاق سے ہے، جیسے: حسد، کینہ وغیرہ۔

(۲) وہ جن کا تعلق افعال سے ہے، جیسے: بُرے ارادے۔

(۳) جن کا تعلق عقائد سے ہے، جیسے: بد عقیدگی، کفر وغیرہ۔

یہاں تیسری قسم مراد ہے، یعنی: بد عقیدگی اور کفر تو پہلے ہی سے موجود ہے اور اب دن بدن زیادتی ہوتی جا رہی ہے۔ یا تینوں مراد ہیں، یعنی: ان میں بد عقیدگی، بد عملی اور بد اخلاق سب بیماریاں موجود ہیں، اب زیادتی ہوتی جا رہی ہے۔

{فَزَادَهُمُ اللّٰهُ} "زَادَ": لازم و متعدّی دونوں آتا ہے، معنیٰ: زیادہ ہوا، زیادہ کیا، یہاں متعدّی ہے، یعنی: اللہ نے اُن کی بیماری بڑھا دی۔

بڑھانے کی چند صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ انھیں اسلام کو دیکھ کر غم ہوتا تھا، اللہ نے اشاعتِ اسلام کر کے اُن کے غم کو بڑھا دیا۔

(۲) اُن کے دل میں بد عقیدگی اور حضور کی دشمنی تھی، اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی، کہ وعظ و نصیحت اثر نہ کرے، کفر بڑھا دیا۔

(۳) جس قدر شرعی احکام بڑھے اُن کا انکار بڑھتا گیا، مثلاً دس کے بعد پندرہ احکام کے منکر ہو گئے۔

(۴) جب تک فقط عبادات آئی تھیں وہی اُن پر بھاری تھیں اور جب سزائیں اور جہاد

آگئے تواُن پر اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔

اللہ کی شان ہے کہ شرعی احکام اور قرآنی آیتیں مسلمانوں کے ایمان کو قوی کریں، لیکن ان سے کفار کا کفر بڑھے۔ بارش کا پانی گندگی پر پڑکر اور پھیلاتا ہے، مگر پاک چیزوں پر پڑکر اُن کو اور صاف کرتا ہے۔

کھلے کافر، جن میں بہادری تھی، اسلام کا دبدبہ دیکھ کر بُزدل ہوگئے، جس کی وجہ سے منافق بننے پر مجبور ہوگئے۔

پھر جس طرح دنیامیں اُ ن کی بیماری بڑھتی جارہی ہے، اسی طرح آخرت میں ان کا عذاب بھی بڑھتا جارہاہے اور مسلمانوں کا ثواب بڑھ رہاہے۔

''اَلِیْم '': ''الم '' سے ہے۔ معنٰی: درد، تکلیف۔ الیم کا معنیٰ: دردناک۔ کفار کے عذاب کو ''عظیم'' اور منافقوں کے عذاب کو'' الیم'' کہاگیا، کیوں کہ کفار کے مقابلے میں اُن کو تکلیف زیادہ ہوگی، کفار نے ایمان کی مٹھاس اور چاشنی نہ پائی تھی اور انھوں نے مزاچکھ لیاتھا، کفار کے حواسِ ظاہرہ تک کلام ونورِ ایمان کی چاشنی نہ پہنچی تھی، اُ ن کو خبر نہ تھی کہ نماز میں کیا بہار ہے، کیاخوبی ہے ، منافقین کو خبر تھی زبان کو مٹھاس معلوم تھی اور پھل نہ کھاسکے تو بہت صدمہ ہوگا۔ جیسے ایک نے میوہ چکھاہی نہیں، کسی نے مزہ دار میوہ چکھاتھا، اور پھل نہ ملے تو حسرت زیادہ ہوگی کہ چکھ کر محروم ہوگئے۔ کھلے کافروں کو صرف دوزخ کا عذاب ہوگا، منافقوں کو عذاب بھی اور طعنہ بھی، اس لیے اُن کو تکلیف زیادہ ہوگی۔ جھوٹ کی وجہ سے جہنم کے آخری طبقے میں رکھاجائے گا، جہاں اور طبقات سے دوزخیوں کی پیپ وغیرہ بہ کر آئے گی اور وہی ان کو پلائی جائے گی توکفر کی وجہ سے عذاب ہوا اور جھوٹ، فریب کی وجہ سے درد پہنچا۔

''یَکْذِبُوْنَ ''میں اشارہ ہے کہ اُن پر مصیبتیں جھوٹ کی وجہ سے آئیں۔

جھوٹ کئی قسم کا ہوتا ہے:

(۱) قول میں جھوٹ، کہ خلافِ واقع خبر دے۔

(۲) فعل میں جھوٹ، کہ عمل قول کے خلاف ہو۔

(۳) عقیدے میں جھوٹ، جیسے چند خالق ماننا۔

ہر جھوٹ بُرا ہے، لیکن عقیدے کا جھوٹ سخت برا ہے۔ اور یہ منافق ہر طرح جھوٹ بولتے تھے۔

جھوٹ بد ترین گناہ، سخت عیب ہے، مخفی عیب ہے، بلکہ ہزاروں گناہوں کی جڑ ہے۔

اگر کوئی شخص جھوٹ نہ بولنے کا عہد کرے تو گناہوں سے بچ جائے گا۔ انبیاے کرام سارے گناہوں سے محفوظ تھے، خصوصاً جھوٹ سے، جو شخص انھیں جھوٹا جانے وہ بے دین ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں جو آیا کہ معاذ اللہ انھوں نے تین جھوٹ بولے تو یہاں جھوٹ سے مراد "تعریض" ہے۔ تعریض: دو معنی والے لفظ کو کہتے ہیں۔ آپ نے اپنی بیوی سارہ رضی اللہ عنہا کو بہن کہا، اگلے نے نسبتی بہن سمجھا اور آپ نے دینی بہن کہا۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت میں سرکار علیہ السلام کی معیت میں جا رہے تھے تو ایک کافر نے پوچھا، کون؟ آپ نے فرمایا: رہنما، اس نے سمجھا، دنیوی راستہ دِکھانے والا، اور آپ کی مراد دینی رہنما یعنی پیغمبر تھی، یہ تعریض ہے اور ضرورۃً جائز ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۶۶۔۱۶۷]

جھوٹ بہر حال منع اور گناہ ہے، سوا چند جگہوں کے، سخت مجبوری کی حالت میں:

(۱) دو مسلمانوں میں صلح کے لیے۔

(۲) بیوی کو راضی کرنے کے لیے۔

(۳) جہاد کے موقع پر۔

جھوٹ سے جس طرح اخروی عذاب آتا ہے، ایسے ہی دنیا میں بھی مصیبت آتی ہے۔

{وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ}

(اور جو اُن سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو سنوارنے والے ہیں)

تعلق: (۱) پہلے بتایا گیا کہ ان منافقوں کی بیماری انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اب اس کی نشانی بتائی جا رہی ہے کہ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتے، بلکہ ہر ایک کو غلط سمجھتے ہیں۔

(۲) پہلے عبادات کا ذکر تھا اب معاملات کا ذکر ہے۔

نوٹ: جن اعمال کا تعلق رب سے ہو عبادات ہیں، جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ اور جن اعمال کا تعلق بندوں سے ہو اُن کو معاملات کہتے ہیں، جیسے تجارت، لین دین، برتاو۔ منافقین کے دونوں قسم کے اعمال خراب تھے۔

تفسیر: ''قِيْلَ '': ''قَوْل '' سے بنا ہے، بات بولنا، کہنا، دل کے خیالات، رائے۔ یہاں کہنا یا رائے دینا مراد ہے۔

کہنے والا کون ہے؟ اس میں چند احتمال ہیں: (۱) رب تعالی نے نبی کے ذریعے کہلوایا۔ (۲) خود نبی علیہ السلام (۳) عام مومنین۔ (۴) وہ مسلمان جن سے فتنے کی باتیں کرتے تھے۔

{لَا تُفْسِدُوا}: ''فساد'' سے ہے۔ معنی: بگڑنا۔ یعنی: کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا، یعنی نفع کے قابل نہ رہنا۔ اس کا مقابل ''صلاح'' ہے، معنی: سنورنا، نفع کے قابل ہونا۔ صلاح و فساد میں بہت گنجائش ہے۔ نفس کا فساد، دو شخصوں کا فساد، شہر کا فساد، کسی خاص ملک کا فساد، اور زمین کا فساد۔ ''فی الارض'' سے معلوم ہوا کہ زمین کا فساد مراد ہے۔

منافقین سے کہا گیا کہ تم تو خود بگڑے ہوئے ہو تو اوروں پر مہربانی کرو اور اللہ کی زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ معلوم ہوا کہ منافقین کی بیماری متعدّی یعنی پھیلنے والی تھی۔

اب یہاں فساد سے کیا مراد ہے اس بارے میں چند قول ہیں:

(۱) عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہاں فساد سے مراد علانیہ گناہ کرنا

ہے، کیوں کہ علانیہ گناہ سے خدا کی رحمت بند ہو جاتی ہے، عذاب نازل ہوتے ہیں، قتل وخون، غارت گری وغیرہ شروع ہو جاتی ہے۔ چوں کہ یہ موقع پا کر علانیہ گناہ کرتے تھے اس سے روکا گیا۔ اور صحابۂ کرام محبت رسول کی برکت سے گناہ سے بچتے، اگر ہو جاتا تو چھپاتے اور بارگاہ نبوی میں آکر اقرار کر کے معافی مانگتے، سزائیں لیتے۔ منافق وہ مردودِ ازلی ٹولہ تھا جو دربار میں رہ کر درست نہ ہوا، انھیں کہا گیا کہ حضور کے نام کو بٹہ نہ لگاؤ اور فساد نہ کرو۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۶۹۔ ۱۷۰]

(۲) فساد سے مراد، کفار سے ملنا، اُن کی تواضع کرنا، خوش آمد کرنا ہے۔ یعنی: تم ایک طرف کے ہو کے رہو، تمھاری یہ حرکتیں فساد پھیلاتی ہیں۔

(۳) فساد سے مراد مسلمانوں کے راز کفار تک پہنچانا ہے، چوں کہ منافقین مسلمانوں میں رہتے تھے، اس لیے مسلمانوں کی جنگی تدبیریں معلوم ہو جاتی تھیں اور وہ کفار کو اُن کی خبر دیتے تھے۔ انھیں روکا گیا۔

(۴) منافقین، نومسلموں سے خفیہ مل کر اسلام کے خلاف شکوک وشبہات اُن کے دلوں میں ڈالتے تھے اور وہ نومسلم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ پُرانے مسلمان اسلام پر مطمئن نہیں تو ضرور اسلام میں کچھ خرابی ہوگی۔ یہاں ''فساد'' سے اُن کی یہی حرکت مراد ہے، جس سے روکا گیا اور روکا جا رہا ہے۔

''قالوا'' سے مراد انھیں منافقین کا قول ہے، جن کو فساد سے روکا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم فساد نہیں پھیلاتے، بلکہ اصلاح کرتے ہیں، یعنی: اے مسلمانو! جس چیز کو تم فساد سمجھتے ہو اُس کو ہم اصلاح سمجھتے ہیں، کیوں کہ تمھارا اسلام فساد ہے اور ہم اُس کو مٹانا چاہتے ہیں۔

''مصلحون'' سے صلح کرانے کا معنی بھی مراد ہو سکتا ہے، یعنی: منافقین یہ کہتے تھے کہ ہم کافروں کی مدارات وغیرہ اس لیے کرتے ہیں کہ تاکہ تم میں اور ان میں صلح قائم رہے اور مدینہ میں کشت وخون نہ ہو۔ اور اے مسلمانو! تمھاری کوشش ہے کہ کشت وخون ہو جائے،

لہذا ہم ہی مصلح ہیں، نہ کہ تم، اسی لیے انھوں نے ''اِنَّمَا'' کہا، جو کہ حصر کے لیے آتا ہے۔

خلاصہ: اُن کی دلی بیماری اس قدر غالب آگئی تھی کہ بُرے بھلے کی تمیز نہ رہی، کیوں کہ جب اُن سے کہا جاتا کہ تم چغل خوری، غمازی اور گناہوں سے ملک میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے کہ ہم تو بھلائی کرتے ہیں، ان گناہوں کو بھلائی سمجھ بیٹھے، جیسے بعض بیمار، میٹھی چیز کو کڑوی اور کڑوی کو میٹھی سمجھتے ہیں، یہی حال اُن کا تھا۔ اور جب انسان اپنے عیب کو ہنر سمجھنے لگے تو اُس کی ہدایت مشکل ہے وہ جاہلِ مرکب ہے۔

نوٹ: یہ سمجھ لینا کہ اس قسم کے لوگ پہلے تھے، اب نہیں سخت غلطی ہے، اب بھی بکثرت موجود ہیں۔

فائدے: (۱) کفر در اصل فساد ہے، کیوں کہ یہ حق تعالیٰ سے بغاوت ہے۔ اور بادشاہ کی بغاوت سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں ہو سکتا۔

(۲) اسلام و شریعت کی اطاعت زمین کی اصلاح ہے، کیوں کہ یہ وفاداری ہے، اگر کوئی شخص کفر کر کے کشت و خون بند کر دے تو وہ بھی مفسد ہے۔ اور دوسرا شخص اسلام پھیلانے اور ہدایت دینے کے لیے جہاد و قتال بھی کرے تو وہ مصلح ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی کا عضو گل جائے، جس سے دوسرے عضو کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو طبیب اس عضو کو کاٹ دیتا ہے اور وہ بے وقوف ہے جو یہ کہے کہ عضو نہیں کٹوائیں گے، کیوں کہ عضو کاٹنا فساد ہے، جسم کو فاسد کرتا ہے، میں تو اصلاح چاہتا ہوں، عضو اپنی جگہ رہنے دوں گا۔ اگرچہ یہاں بہ ظاہر طبیب جسم کو بگاڑتا ہے اور وہ بیمار اس فساد سے بچنا چاہتا ہے، لیکن در حقیقت طبیب مصلح ہے اور مریض مفسد ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ بیمار کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے۔ منافقین اصلاحِ جسم چاہتے تھے، وہ دونوں جہاں میں خرابی کی باعث تھی۔ ضرورت کے وقت جہاد نہ کرنا فساد ہے اور جہاد کرنا اصلاح ہے۔

(۳) کفار سے میل جول رکھنا، دینی معاملات میں خاطر تواضع کرنا، چاپلوسی کرنا،

خوشامدیں کرنا، اُن کی خوشی کے لیے صلح کل بن جانا اور حق گوئی سے باز رہنا منافقوں کی شان ہے۔

"منافق دو قسم کا ہے (۱) منافقِ عملی اور (۲) منافقِ اعتقادی۔ نفاقِ عملی حرام ہے اور نفاقِ اعتقادی کفر ہے۔ جیسا کہ اس زمانہ میں بہت لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے، سمجھ لو! مسلمانوں کی ترقی محض تعداد بڑھانے سے نہ ہوگی، بلکہ حق کے ذریعہ ہوگی۔ تولہ بھر عطر، مٹکا بھر شراب میں ملا دو، عطر بڑھ گیا، مگر عطر نہ رہا۔ اتفاق اچھی چیز ہے، مگر کس سے؟ مسلمانوں سے۔ تنظیم اچھی چیز ہے، کس کی؟ مسلمانوں کی۔ غلط تنظیم کو مٹانا اسلام کا اولین فرض ہے، حضور علیہ السلام نے جلوہ گر ہو کر غلط تنظیموں کو ہی مٹایا۔ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یزیدی تنظیم کی دھجیاں اڑا دیں، اپنی قلت اور مخالفین کی کثرت کی بالکل پروا نہ کی۔" [تفسیر نعیمی ۱/۱۷۱]

اس وقت تنظیم کی رٹ اور اتفاق واتحاد کی رٹ لگانے والے اور گیت گانے والے اسلامی تنظیم چھوڑ کر غلط سیاسی تنظیم کے پیچھے پڑے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان، دیوبندی، وہابی، قادیانی، ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ مل کر ایک ہو جائیں، یہ نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ روشنی تاریکی، کفر و ایمان میں کبھی اتفاق ہوا ہی نہیں، ایسا کرنے والے اگر مسلم تنظیم قائم کرتے تو بہت کامیاب ہوتے۔

مسلمان ایک ہوں اور کفار سے علاحدہ رہیں، کسی کو دوست نہ بنائیں، ارشاد ہے:

{لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ}

[مسلمان کفّار کو دوست نہ بنائیں۔ سورۂ آل عمران:۲۸]

تفسیر صوفیانہ: عمدہ زمین میں جس قسم کا بیج ڈالو گے ویسا ہی اُگے گا، انسانی دل میں ہر قسم کا تخم ہے، ایمان کا بیج بویا تو عمدہ پھل آئیں گے اور بے ایمانی اور کفر کا بیج بویا تو کانٹے ہوں گے۔ اے منافقو! اپنے اس قلب میں کفر و نفاق کا بیج ڈال کر فاسد نہ کرو، بلکہ ایمان

کا بیج بو کر اور عبادات کا پانی دے کر، نیک صحبتوں کی ہوا لگا کر پھل دار درخت پیدا کرو۔ لیکن وہ اپنی بے وقوفی سے کانٹے بو کر پھل کے امیدوار ہیں۔[تفسیر نعیمی ۱/۱۷۱]

{ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ }

(سنتا ہے! وہ ہی فسادی ہیں، مگر انھیں شعور نہیں)[البقرہ:۱۱]

تعلق: پہلے منافقین کی بکواس کا تذکرہ ہوا اور اب اس کی تردید ہو رہی ہے۔ جس شدومد سے انھوں نے اپنی تعریف کی تھی، اس سے بڑھ کر اُن کی تردید ہو رہی ہے۔

تفسیر: ''اَلا'' حرفِ تنبیہ ہے، غافل کو آگاہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کبھی مضمون کی اہمیت کے لیے ہوتا ہے۔ جس کا ترجمہ ''خبردار'' ہے، یہاں مضمون کی اہمیت کے لیے ہے۔

{اِنَّهُمْ }۔ محلّ ''اِنّ'' وہ ہے جہاں کوئی منکر ہو یا انکار کا احتمال ہو۔ چوں کہ منافقین وکفار اس کلام کے منکر تھے اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے انکار کا احتمال تھا، کیوں کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ منافقین امن پسند اور صلح کل ہیں۔ اور مسلمان جنگ جُو اور شورش پسند ہیں، اس لیے ''اِنَّ'' لایا گیا کہ یقیناً یہ صلح پسندی نہیں، بلکہ عینِ فساد ہے۔

{هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ } اس میں دوبارہ ''هُمْ'' لاکر حصر کیا گیا کہ بے شک منافقین ہی فسادی ہیں، نہ کہ مسلمان۔ انھوں نے ''اِنّما'' کہہ کر حصر کیا تھا کہ ہم ہی مصلح ہیں، نہ کہ مسلمان۔ حق تعالیٰ نے جواب دیا اور ''هُمْ'' فرما کر بتایا کہ منافقین ہی فسادی ہیں، نہ کہ مسلمان۔

''المفسدون'' میں بہت گنجائش ہے۔ ''فساد'' کے معنی بگاڑنے کے ہیں۔ بگاڑنے والے یہ منافقین ہیں۔ اپنی زبان، خیال اور سارے اعضا کو کفر سے بگاڑتے ہیں۔ اور لوگوں کو ایمان سے روک کر بگاڑتے ہیں، کافروں کو کفر میں مضبوط کر کے بگاڑتے ہیں، زمین کو اللہ کے ذکر سے روک کر بگاڑتے ہیں۔ یہ ہر طرح سے مفسد ہیں اور یہی مفسد ہیں۔

{ولکن لا یشعرون} "شعور": حواس سے جاننے کو کہتے ہیں۔ منافقوں کا مفسد ہونا اس قدر ظاہر ہے کہ گویا آنکھ سے نظر آرہا ہے، لیکن ان کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کہ ایسی کھلی ہوئی چیز بھی محسوس نہیں کر سکتے، کیوں کہ تقیہ کا بُرا ہونا تمام مذہبوں میں مسلم ہے۔ دوغلے آدمی کو سب ہی بُرا کہتے ہیں۔

خلاصہ: یہی لوگ اول درجہ کے مفسد ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ اول درجہ کے بے شعور بھی ہیں، کہ اُ ن کو فساد و اصلاح کی تمیز نہ رہی۔ دل کے اندھے ہونے سے ظاہری اعتقاد بھی برباد ہو جاتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ: انسان کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور دین سے بھی۔ لیکن دنیا و دین آپس میں ضد ہیں، دنیا کو سنبھالنا دین کو بگاڑنا ہے۔ اور دین کو سنبھالنا دنیا کو فاسد کرنا ہے۔ حقیقت پر نظر رکھنے والے دین کی زیادہ فکر رکھتے ہیں، لیکن ظاہر بیں لوگ دنیا کو دین پر مقدم سمجھتے ہیں، کہ دنیا کے لیے دین برباد کر ڈالتے ہیں۔

منافقین انہی لوگوں میں سے تھے جن کی نگاہ میں فقط دنیا کا حاصل کر لینا انتہائی کمال تھا، اس لیے وہ اپنے اس کام کو اصلاح کہتے تھے اور رب تعالیٰ اس کو فساد قرار دیتا ہے، کیوں کہ یہ اپنی دنیا سنبھال کر دین بگاڑ رہے تھے، باقی کو چھوڑ کر فانی چیز اختیار کرنا یقیناً فساد ہی ہے۔

صوفیہ کے نزدیک دنیا وہ ہے جو رب سے غافل کر دے۔ خوراک، پوشاک، زن، فرزند اور دیگر جائز کاروبار اگر رسول کی اتباع میں کیا جائے تو سب عین دین ہے۔ [تفسیر نعیمی ا/۱۷۳]

فائدے:

(ا) جو کوئی اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرتا ہے وہ حق تعالیٰ کا مقابل قرار پاتا ہے، مقبول بندوں پر اعتراض کرنا در پردہ حق تعالیٰ پر اعتراض کرنا ہے، کیوں کہ منافقین نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا، نہ کہ رب پر۔ مگر جواب رب نے دیا۔ معلوم ہوا کہ رب نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا۔

(۲) معلوم ہوا کہ جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔ جو اپنے عمل و کردار سے شرعی احکام کی اشاعت کرکے اللہ تعالی کا وکیل ہوجاتا ہے تو اللہ تعالی اس کا وکیل ہوجاتا ہے۔ جو رب کی اطاعت کی فکر میں رہتا ہے رب تعالی اس کو دنیوی الجھنوں سے آزاد کردیتا ہے۔ ارشاد ہے: {فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا} [سورہ مزمل:۹]

(۳) صحابۂ کرام کو فسادی کہنا منافقوں کا طریقہ ہے، اپنے کو مصلح اور صحابہ کو فسادی کہتے تھے، رب تعالی نے صحابہ کی طرف سے اُن کو فسادی کہا۔ کوئی صحابی فسادی نہیں۔ ان کی آپس کی لڑائیاں بھی فساد نہیں، کیوں کہ وہ نفس کے لیے نہیں لڑتے تھے۔ منافقوں کی نمازیں بھی فساد ہیں، کہ نفسانی ہیں، رحمانی نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کو رب نے فسادی نہ کہا، بلکہ انھیں ہدایت کا تارا قرار دیا۔ {اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا} [میں نے گیارہ ستارے دیکھے ہیں] [سورہ یوسف:۴]

{وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ}

اور جب اُن سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لائیں، سنتا ہے! وہ ہی احمق ہیں، مگر جانتے نہیں۔ [البقرہ:۱۳]

تعلق: (۱) پہلے منافقین کی دو قسم کی برائیاں بیان ہوئیں۔ اب تیسری قسم کی۔

(۲) پہلے بتایا گیا کہ مسلمان منافقین کو فساد سے منع کرتے تھے اور وہ نہیں مانتے تھے۔ اب بتایا جارہا ہے کہ ان کو حقیقی ایمان کی طرف بلاتے تھے وہ یہ بھی نہ مانتے تھے۔ چوں کہ مکمل تبلیغ یہی ہے کہ گم راہ کو برائی سے روکا جائے اور بھلائی کی طرف بلایا جائے، تو تبلیغ کا ایک حصہ برائی سے روکنا پہلے ذکر ہوا اور اب حقیقی ایمان کی دعوت دینا مذکور ہوا۔ تبلیغ کا طریقہ بتایا گیا، چوں کہ فساد سے باز رہنا حقیقی ایمان کے لیے شرط ہے۔ اس لیے اس کو پہلے

اور اس کو بعد میں بیان کیا۔

تفسیر: ''قِیل'' میں کس کا قول بیان ہوا؟ رب کا؟ رسول کا؟ مسلمانوں کا؟ تینوں احتمال ہیں۔

{اٰمِنُوْا} میں ایمان کا حکم ہے۔ وہ پہلے ہی بہ ظاہر مومن تھے، جس سے معلوم ہوا کہ زبانی ایمان بالکل معتبر نہیں۔ یہاں ایمان لانے کا ذکر ہے، لیکن کس پر ایمان لاؤ اس کا ذکر آگے ہوا کہ جیسے لوگ ایمان لائے۔

''النّاس'' میں یا تو جنس مراد ہے (یعنی: انسان) یعنی: تم آدمیوں کی طرح ایمان لاؤ۔ معلوم ہوا جو مومن نہیں وہ حقیقت میں آدمی ہی نہیں ہے، بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے کہ وہ مالک کو پہچانے اور یہ نہ پہچانے۔

یا بعض لوگ مراد ہیں۔ یعنی سرکار علیہ السلام اور سارے جاں نثار صحابہ، یا اُن منافقین کے دوسرے اہلِ وطن مخلصین، یا اُن کے اہلِ قرابت مومنین۔

تفسیر عزیزی میں ہے کہ ''النّاس'' سے مراد ابو بکر، عمر، عثمان و علی رضی اللہ عنہم ہیں۔ چوں کہ اس زمانے میں یہ لوگ خلوص ایمان میں بہت مشہور ہو چکے تھے، اس لیے اِن کا ایمان اوروں کے لیے معیار بن چکا تھا۔ جس کا ایمان ان لوگوں کی طرح ہو وہ مومن ہے۔ ورنہ نہیں۔ گویا کہا گیا کہ اے منافقو! تم ظاہری ایمان والے ہو، مگر بے کار ہے، اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو صدیق و فاروق والا ایمان لے آؤ۔ بازار میں اس کی قیمت ہوتی ہے جس پر کارخانے کی مہر ہو، ایسے ہی بازارِ محبت میں اس ایمان کی قیمت ہے جس پر مصطفی علیہ السلام کی مہر لگی ہو اور وہ صدیقی و فاروقی ایمان ہے۔ [تفسیر عزیزی ۱/۲۳۶]

''السُّفَهَاء'': ''سَفَهٌ'' سے ہے۔ معنی: ہلکا پن۔ اہل عرب کا قول ہے: ''سَفَهَتْهُ الرِّيحُ'' یعنی: اُس کو ہوا اُڑا لے گئی، اس کا مقابل ''حِلم'' و ''اَناة'' یعنی بُردباری اور دور اندیشی ہے۔

منافقوں نے چند وجوہ سے مسلمانوں کو بے وقوف کہا تھا:

(۱) اس وقت اکثر و بیشتر مسلمان غریب و مسکین تھے اور منافقین مال دار تھے، ان کی حقارت بیان کرتے ہوئے یہ لفظ ادا کیا۔

(۲) منافقین اسلام کو باطل دین اور کفر کو سچا دین سمجھتے تھے۔ اور جو باطل دین اختیار کرے وہ بے وقوف ہے۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے یہ لفظ ادا کیا۔

(۳) چوں کہ مسلمانوں نے دین کے مقابلے میں دنیا پر لات ماردی تھی، منافقین سمجھے کہ دنیوی نفع نقد ہے اور دینی نفع اُدھار، اور اُدھار بھی ایسا کہ موت وقیامت سے پہلے نہ وصول ہوسکے، تو نقد کو چھوڑ کر اُدھار لینے والا ان کے نزدیک بے وقوف تھا۔

(۴) اس لیے کہ منافقین کے خیال میں دنیوی نعمتیں یقینی تھیں اور دینی فائدے، جنت اور وہاں کی نعمتیں وغیرہ محض خیالی اور وہمی تھیں، یعنی: پہلے یہی نہیں معلوم کہ اس کی کچھ حقیقت بھی ہے یا نہیں، اور اگر کچھ ہے تو ہمیں ملیں یا نہ ملیں۔ اور اگر ملیں تو نہ معلوم کب اور کس طرح؟ تو محض وہمی اور خیالی چیزوں کی امید پر ان یقینی نفعوں کو چھوڑنا بے وقوفی ہے۔

(۵) اس لیے کہ کفارِ مدینہ سے ہمیشہ تعلقات رہے ہیں اور رہیں گے، اسلام ایک پردیسی مذہب اور مسلمان لوگ مسافر ہیں۔ نہ معلوم یہ دین باقی رہے یا نہ رہے، ان پردیسی لوگوں اور عارضی دین کی محبت میں اپنے اصلی اور حقیقی دوستوں سے بگاڑ کرلینا بے وقوفی ہے۔ ہم نے ایسی عقل مندی کی ہے کہ اس پر شیطان بھی قربان ہوجائے وہ یہ کہ دونوں کو راضی رکھا، اگر مسلمان غالب رہیں تو ہم ان سے نفع کریں گے اور اگر کفار غالب رہے تو ان سے—— ہماری پانچوں انگلی گھی میں ہے، دوطرفہ رہنا نہایت عقل مندی ہے۔

رب نے جھوٹے خیالات کی نفیس تردید فرمائی: {اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ} [آگاہ، وہی لوگ بے وقوف ہیں] [البقرہ:۱۳]

حق تعالیٰ نے چند وجہوں سے منافقین کو بے وقوف کہا:

(۱) انھوں نے مٹنے والی نعمتوں کی خاطر باقی رہنے والی نعمتوں کو چھوڑ دیا۔

(۲) انھوں نے قوی دلائل کے مقابلے میں اپنے فاسد خیالات پر اعتماد کیا۔

(۳) یہ دو گھر کا مہمان بنے جو ہمیشہ بھوکا رہتا ہے۔

(۴) یہ مکر اس وقت چل سکتا تھا جب کہ مسلمانوں کو ان کی حقیقت کا علم نہ ہو، حالاں کہ رب نے اُن کی قلعی کھول دی۔

(۵) انھوں نے نبی کریم علیہ السلام کی مخالفت کی جو حقیقت میں رب کی مخالفت ہے، رب کی مخالفت کرکے کوئی عزت نہیں پاسکتا، اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شفا حاصل کرنے کے لیے سانپ سے کٹوالے۔

پہلے {لَا یَشْعُرُوْنَ} سے شعور کی نفی تھی، اب {لَا یَعْلَمُوْنَ} سے علم کی نفی ہوئی، کیوں کہ:

(۱) وہاں فساد کا ذکر تھا جو حواس سے محسوس ہوتا ہے اور یہاں بے وقوفی کا ذکر ہوا جو عقل سے معلوم ہوتی ہے۔

(۲) منافقین نے مسلمانوں کو بے وقوف کہا تو رب نے ان کو جاہل فرمایا۔

(۳) رب نے اُن کو بے وقوف کہا، پھر فرمایا کہ اُن کو اپنی بے وقوفی کی بھی خبر نہیں، کیوں کہ علم تو عقل سے حاصل ہوتا ہے، جب یہ عقل ہی سے محروم ہیں تو علم کیسے پاسکتے ہیں۔

روح البیان میں ہے: حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے تو جبریل علیہ السلام تین چیز لائے، علم، حیا، عقل۔ کہ ان میں سے ایک لے لیں، حضرت آدم علیہ السلام نے عقل کو لے لیا، علم وحیا سے کہا واپس جاؤ۔ ان دونوں نے عرض کیا کہ ہم عالمِ ارواح میں بھی عقل کے ساتھ ہی رہے اور اب بھی ساتھ ہی رہیں گے۔ عقل دماغ میں، اور حیا آنکھوں میں اور علم دل میں قائم ہوگئے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۷۶]

خلاصۂ تفسیر: جب کوئی خیر خواہ اُن سے کہتا کہ تم اللہ والوں کی طرح حقیقی ایمان لے آو، جس سے فتنہ فساد بند ہو جائے اور دنیا سے نفرت اور آخرت سے الفت حاصل ہو اور تمھارا شمار بھی آخرت کے ان لوگوں میں ہو جائے جو حقیقۃً انسان ہیں، تو منافقین جواب دیتے کہ کیا ہم بھی ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں، جنھوں نے خیالی جنت کے لیے دنیوی راحتوں کو ٹھکرا دیا، بھائی دنیا دین سے مقدم ہے، آخرت کس نے دیکھی ہے؟

حق تعالی نے جواب میں ارشاد فرمایا یہ لوگ بڑے ہی احمق و بے وقوف ہیں، کیوں کہ اِن کی یہ دو رنگی چال بہت ہی خطرناک ہے۔ کبھی ایسا وقت آئے گا کہ دنیا میں انھیں کوئی نہ پوچھے گا، اور قیامت تک اُن پر لعن طعن ہوتی رہے گی۔ [تفسیر نعیمی ار ۱۷۷]

فائدے: (۱) دینی باتوں میں اللہ کے مقبول بندوں کی پیروی ضروری ہے، کیوں کہ یہاں حکم دیا گیا ہے کہ مقبولوں کی طرح ایمان لاؤ۔

(۲) مذہبِ اہلِ سنت حق ہے، اس میں سلف صالحین اور سنت رسول اللہ علیہ التحیۃ والثنا کی پیروی ضروری ہے۔

(۳) وہابی، دیوبندی، تمام باطل فرقے گم راہ ہیں، کیوں کہ غیر مقلدین میں تقلید حرام ہے، یعنی: اللہ والوں کے راستہ پر چلنا بُرا ہے۔ دیوبندی ان سارے امورِ خیر کو شرک کہتے ہیں جن پر علمائے عرب و عجم اور مسلمانوں کا عمل ہے۔

(۴) صالحین کو برا کہنا منافقوں کا طریقہ ہے، رافضی، خلفائے راشدین کو، خارجی علی مرتضی کو برا کہتے ہیں، بلکہ تبرا، روافض کا رکنِ ایمان ہے۔ منافق، صحابہ کو سفہا کہہ کر تبرا کرتے تھے۔ غیر مقلد، اماموں کو، خاص کر امام اعظم رضی اللہ تعالی عنہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ دیوبندی، تمام اولیا کو مشرک اور علما کو مشرک و کافر کہتے ہیں، کیوں کہ میلاد شریف شرک ٹھہرا تو کوئی ولی نہ بچا۔ مرزائی، تمام انبیا کو، نیچری، تمام اکابر کو اور چکڑالوی، صحابۂ کرام کو بُرا کہتے ہیں۔

(۵) دین دار عالموں کو تسلی ہے کہ وہ بے دینوں کی بدزبانی سے رنجیدہ نہ ہوں، بلکہ یہ

سمجھ لیں کہ اہلِ باطل کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے۔ علما، دین کے چوکی دار ہیں۔

(۶) مقبولانِ خدا کا دشمن، خدا کا دشمن ہے۔

(۷) صحابہ پر تبرا منافقوں کا طریقہ ہے۔

تفسیر صوفیانہ: انسان دنیا میں مسافر ہے، عالمِ ارواح میں اپنے مالک سے عہد و پیمان کر کے آیا ہے، دنیا کے باغ و بہار میں پھنس گیا ہے اور اپنے اصلی وطن کو بھول گیا ہے۔ وطن سے خط، چٹھی قاصد آئے، خیال نہ کیا اور الٹا اس کا مذاق اڑایا اور اہلِ دل کو مجنوں اور دیوانہ کہا۔

صوفیہ کے یہاں علم دو ہیں: (۱) علم ظاہری (۲) علم لدُنّی، کیوں کہ قلب کے دو دروازے ہیں (۱) اندرونی (۲) بیرونی۔ بیرونی دروازے حواس ہیں، جن سے ظاہری علم حاصل ہوتا ہے۔ اندرونی دروازہ الہام ہے جس سے علمِ باطنی حاصل ہوتا ہے۔ جو فقط ظاہری پر اعتماد کر کے باطنی دروازہ بند کر لے نرا جاہل ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۸۹]

{ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ }

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں کہیں ہم تمھارے ساتھ ہیں، ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں۔ [البقرۃ:۱۴]

تعلق: (۱) پہلے تین عیب منافقین کے بتائے گئے، اب چوتھا عیب بتایا جا رہا ہے۔

(۲) پہلے منافقین کی دینی حالت اور صرف مسلمانوں کے ساتھ برتاو بتایا گیا تھا اور اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اُن کا معاملہ کفار و مومنین کے ساتھ کیسا ہے۔

شانِ نزول: عبد اللہ بن اُبَی اور دیگر منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، ایک بار انھوں نے صحابۂ کرام کی جماعت کو آتے دیکھا تو عبد اللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ

دیکھو! میں ان کو کیسا بنا تا ہوں۔ جب یہ حضرات قریب پہنچے تو صدیق اکبر کا ہاتھ پکڑ کر کہنا شروع کیا کہ آپ صدیق ہیں، بنی تمیم کے سردار، شیخ الاسلام، یارِ غار، جان و مال کو حضور پر قربان کرنے والے ہیں۔ پھر فاروق اعظم کا ہاتھ پکڑا اور بولا، سبحان اللہ! آپ بنی عدی کے سردار ہیں، فاروق آپ کا لقب ہے۔ اپنی جان و مال حضور پر قربان کرنے والے ہیں۔ حضرت علی نے ارشاد فرمایا: اے عبد اللہ! رب سے ڈر، نفاق چھوڑ، منافقین سب سے بدتر ہیں۔ وہ بولا، اے علی! یہ آپ کیوں فرماتے ہیں؟ میں آپ لوگوں کی طرح مومن ہوں۔ پھر یہ حضرات چلے گئے تو عبد اللہ اپنی جماعت سے کہنے لگا کہ دیکھا میں نے کیا چال چلی؟ ان لوگوں نے تعریف کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ [تفسیر نعیمی ۱۸۰/۱]

تفسیر: ''لَقُوْا '': ''لَقْیٌ '' سے ہے، معنیٰ: ملاقات کرنا، سامنے آنا۔ یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

''الذین آمنوا '' سے مخلص مسلمان مراد ہیں، زبانی مسلمان تو منافقین بھی تھے۔

''آمنّا '' میں حقیقی ایمان مراد ہے۔ ان کے زبانی ایمان میں شک نہیں تھا، حقیقی ایمان مشکوک تھا، یہ لوگ بار بار قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلاتے تھے۔ ولایتی گھی نام کا گھی ہے۔ اصلی گھی نہیں، آج بھی بے دین لوگوں کا یہی طریقہ ہے، قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کو ظاہر کرتے ہیں، لوگوں کو ان کا اعتبار نہیں ہوتا۔ خالص مشک خود مہکتا ہے۔ ایمان کا نور خود ایمان کو ظاہر کرتا ہے، قسموں کی ضرورت نہیں۔

''خَلَوْ '': ''خَلْوٌ '' سے ہے۔ معنیٰ: اکیلا ہونا اور گزرنا۔ پہلا معنیٰ مراد ہے۔ یعنی: جب منافقین اپنے شیطان کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں کہ جہاں کوئی مسلمان نہ ہو تو یہ گفتگو کرتے ہیں، یہاں ان کے دوست مراد ہیں۔ اہلِ عرب ہر سرکش کو شیطان کہہ دیتے ہیں۔ ایک قول ہے کہ اس جگہ شیاطین سے کفار کاہن مراد ہیں۔

''اِنّا مَعَکُمْ '' ، یعنی: وہ سردارانِ کفار سے کہتے ہیں کہ ہم دینی عقائد میں تمھارے

ساتھ ہیں۔

☆ منافقین، مسلمانوں سے صرف ''آمنا'' کہتے، یعنی: ایمان لائے، یہاں جملہ فعلیہ استعمال کیا اور قسم وغیرہ سے کوئی تاکید نہیں، کیوں کہ مسلمان سیدھے سادے تھے۔ لیکن کفار کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ بغیر تاکید وقسم کے یہ چالاک لوگ مانیں گے نہیں۔ اس لیے ''اِنّ'' وغیرہ سے کلام کی تاکید کرتے تھے۔ اور جملہ اسمیہ بول کر یہ بتاتے تھے کہ ہم پہلے بھی تمھارے ساتھ تھے اور اب بھی تمھارے ساتھ ہیں، لیکن چوں کہ اُن کو پھر بھی شبہ ہوتا تھا کہ یہ تو مسلمانوں کے ساتھ نماز وغیرہ میں ہوتے ہیں، اس لیے اس شبہ کو مٹانے کے لیے یہ کہتے تھے: ''اِنّما نحنُ مستھزء ون''۔ یعنی: اے لوگو! ہمارے ظاہری برتاوے سے دھوکا نہ کھاؤ، ہم تو مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ہمارے دل تمھارے ساتھ ہیں اور یہ ظاہری برتاو محض اس لیے ہے کہ ان کے ساتھ رہ کر اپنے جان ومال کی حفاظت کریں اور مالِ غنیمت لیں، اُن کے خفیہ راز معلوم کرکے تم تک پہنچادیں۔

''مُسْتَھزِء ون'': ''استھزاء'' سے ہے اور وہ ''ھزء'' سے بنا ہے۔ معنیٰ: ہلکاپن۔ جو اچانک مرجائے اس کو ''ھازی'' کہتے ہیں۔ ''استھزاء'' کا معنیٰ: جاہل بنانا، یا ہنسی ٹھٹھا کرنا ہے۔

فائدے:

(۱) دل لگی اور مذاق کے لیے کلمہ پڑھنا کفر ہے۔

(۲) انبیا علیہم السلام اور دین کے ساتھ مذاق کفر ہے۔

(۳) صحابۂ کرام اور علماے دین کا مذاق اڑانا کفر ہے، ہر دینی چیز اور شعائرِ دین کی توہین کفر ہے۔

(۴) ہر ایک محفل میں بیٹھنا اور بدمذہبوں کو دوست بنانا منافقوں کا طریقہ ہے۔ یہ

مرض آج کل عام ہے۔

(۵) لوگوں کا مذاق اڑانا سخت برا ہے۔ ارشاد ہے: {لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ} [یعنی: کوئی قوم دوسری قوم سے مذاق نہ کرے۔ سورۂ حجرات:۱۱]

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ آپ ہم سے دل لگی کرتے ہیں تو فرمایا تھا کہ خدا مجھے اس سے بچائے کہ میں جہلا میں سے ہو جاؤں۔ کسی کا مذاق اڑانا جہالت ہے۔

(۶) مذاق اور ہے۔ خوش طبعی اور — مذاق میں کسی کو ذلیل کرنا مقصود ہوتا ہے اور خوش طبعی مزاح ہے، غم دور کرنا ہے۔ یہ سنت ہے بشرطے کہ جھوٹ نہ ہو۔ مذاق کی ابتدا جائز نہیں اور کوئی کرے تو جواب جائز ہے۔

(۷) مسلمانوں کو در گزر کرنا، کافروں کو نہ چھوڑنا طریقۂ صحابہ ہے۔

{اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ}

(اللہ ان سے استہزا فرماتا ہے اور انھیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہیں)[البقرۃ:۱۵]

تعلق: پہلے منافقین کے چوتھے فریب کا ذکر تھا اب سزا کا ذکر ہو رہا ہے تا کہ لوگ عبرت پکڑیں۔

"استھزاء" کے تین معنی ہیں: (۱) جاہل بنانا، ذلیل کرنا، دل لگی کرنا۔ پہلے دو معنی مراد ہیں نہ کہ تیسرا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ دل لگی سے پاک ہے۔ تو معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جاہل قرار دیتا ہے یا ذلیل کرتا ہے۔ یہاں (یستھزیٔ میں) تین احتمال ہیں (۱) بمعنی حال، یعنی: انھیں دنیا میں ذلیل کرتا ہے، کسی جگہ عزت نہیں ہوتی۔ (۲) بمعنی استقبال، یعنی: قیامت میں ذلیل و رسوا کرے گا۔ یہ منافقین، مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے، کفار جہنم میں۔ حق تعالیٰ تجلّی فرمائے گا، مسلما ن سجدے میں گر جائیں گے، منافقین کی کمر جھک نہیں سکے گی تب فرشتے کتّوں کی طرح انھیں جہنم میں پھینک دیں گے۔ (۳) دوام تجدّدی کے معنی میں ہو۔ یعنی: منافقین تو ایک بار ہی استہزا کرتے ہیں، خدا بار بار، ہمیشہ، ہر جگہ، طرح طرح

سے استہزا فرمائے گا۔ دنیا میں، موت کے وقت، قبر میں، قیامت میں، غرضیکہ ہر جگہ۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۸۴]

"یُمِدُّ" یا "مَدٌّ" سے ہے، معنی: مہلت دینا، یا "مَدَدٌ" سے ہے، معنی: بڑھانا، قوت دینا اور اصلاح کرنا۔ اگر "مَدٌّ" سے ہو تو معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ڈھیل دیتا ہے، وہ جرم کرتے ہیں، پکڑ نہیں ہوتی۔ اور اگر "مَدَدٌ" سے ہو تو معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اُن کی سرکشی اور گمرہی کو زیادہ کرتا ہے اور مضبوط کرتا ہے، کیوں کہ مال و اولاد وغیرہ دیتا ہے، جس سے سمجھتے ہیں کہ رب تعالیٰ ناراض ہوتا تو ہم کو نعمتیں کیوں دیتا۔

تفسیر کبیر میں ہے کہ قرآن میں "مَدَد" شر کے لیے اور "اِمداد" خیر کے لیے استعمال ہوا ہے۔

{فِیْ طُغیانهم} "طغیان": کے لغوی معنی حد سے بڑھ جانا ہے، اس لیے پانی کے سیلاب کو "طغیان" کہتے ہیں، کیوں کہ وہ بھی اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے، لیکن اب استعمال کفر، غرور اور سرکشی میں حد سے بڑھ جانے پر ہوتا ہے۔

"یعمهون": "عمه" سے ہے۔ معنی: دل کا اندھا ہونا۔ "عَمی" کا معنی آنکھ کا اندھا ہونا اور "عمه" دل کا اندھا ہونا ہے۔ یہاں مراد حیران و پریشان ہونا ہے، اندھے کو میدان میں اکیلا چھوڑ دیا جائے تو اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے گا، منزل مقصود کو نہ پہنچے گا۔ اسی طرح ان منافقین نے قرآن اور صاحبِ لولاک علیہ السلام کو نہ پکڑا، کبھی کافروں کی طرف اور کبھی مسلمانوں کی طرف بھٹکتے پھرتے ہیں۔

خلاصہ: منافقین، خود کو عقل مند اور مسلمانوں کو بے وقوف سمجھتے تھے اور دل لگی کرتے تھے، اُن کی بکواس کا رب نے جواب دیا کہ وہ کیا کر پائیں گے اُن کا رب اُن کو ذلیل و خوار کرتا رہے گا۔ جیسے اُن کا ظاہر کچھ، اور باطن کچھ، اسی طرح خدا کا ظاہر کچھ، یعنی: انعام، اور باطن کچھ۔ یہاں ہر سہولت ہے اور قبر میں، حشر میں ذلت و رسوائی ہو گی۔

فائدے: (۱) ایمان میں اطمینان ہے اور کفر میں بے چینی ہے۔

(۲) بندہ کو چاہیے کہ زیادتی عمر و مال و اولاد پر فخر نہ کرے اور اس سے دھوکا نہ کھائے، بہت دفعہ یہ چیزیں عذاب ہوتی ہیں۔

(۳) دنیاوی ترقی قابلِ اعتماد نہیں ہے، یہ پتنگ کی طرح ہے۔

(۴) حق تعالی مسلمانوں کا ایسا والی ہے کہ جو انھیں تکلیف دیتا ہے، حق تعالی اُس سے بدلہ لیتا ہے۔

(۵) جو اپنے ذاتی معاملہ میں بدلہ نہ لے، تو حق تعالی بدلہ لیتا ہے، جو خود بدلہ کے درپے ہو جائے یہ درجہ نہیں پاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ: تصوف کا آخری درجہ فنا فی اللہ ہے، جس میں قالب تو بندہ کا ہوتا ہے اور کام رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ صحابہ فنا فی اللہ تھے، جس قدر رسی لمبی ہوگی، جھٹکا اسی قدر تیز ہوگا، جس قدر چکی دیر میں پیستی ہے اسی قدر آٹا باریک ہوتا ہے۔ لہذا انھیں یہ ڈھیل دشوار ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۸۶]

زیادہ چالاک خدا کے یہاں بے وقوف ہوتا ہے اور سیدھا سادہ مسلمان بڑا عقل مند ہوتا ہے۔

{أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ}

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو اُن کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔ [البقرۃ:۱۶]

تعلق: منافقین کے عیوب بیان کرنے کے بعد یہاں ان عیوب کا نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے، جیسے کوئی بیوپاری، تجارتی غلطیوں کو بیان کرکے آخر میں کہے کہ انجام کار اس کا دیوالیہ ہو گیا اور اپنی اصل پونجی بھی کھو بیٹھا۔

شانِ نزول: یہ آیت اُن کے حق میں نازل ہوئی جو مخلص مومن بننے کے بعد کافر

ہوگئے۔ یا اُن یہود کے حق میں نازل ہوئی جو پہلے نبی کریم علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، مگر جب سرکار آئے تو کچھ کافر ہوگئے اور بعض منافق بن گئے۔ یا اُن کفار کے حق میں اتری، جنھیں اللہ نے عقلِ سلیم عطا فرمائی تھی، مگر انھوں نے عقل وانصاف سے کام نہ لیا، ضد سے گم راہ ہوگئے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۸۸]

تفسیر: ''اولئك'' : اسمِ اشارہ ہے، بعید کے لیے۔ ان منافقین کی صفات اس طرح بیان ہوئیں کہ سب سے چھٹ گئے اور سب کو اُن کی پہچان ہوگئی۔ اور جو چیز خیال میں موجود ہو اس کی طرف بھی اشارہ کردیا جاتا ہے، لہذا اُن کی طرف اشارہ کردیا گیا۔ چوں کہ وہ سب، مسلمانوں سے درجہ میں بہت دور تھے اس لیے اشارۂ بعید کا لفظ آیا۔

''اشتروا'' : ''اشتراء'' سے ہے۔ معنی: خریدنا، یعنی: قیمت خرچ کر کے مالِ مقصود حاصل کرنا۔ یہاں اپنی چیز کے بدلے میں غیر کی چیز لینا مراد ہے۔ ''اشتراء'' : ایک چیز سے بے رغبتی اور دوسری چیز کی لالچ کو بھی کہتے ہیں۔

چوں کہ راہِ راست پر چلنا اور ایمان اختیار کرنا ہر مسلمان کا اصلی فرض ہے، پھر جب کہ منافقین، ہدایت چھوڑ کر، شیطان سے گمرہی سیکھ کر اس فرض کو کھو بیٹھے، اس لیے اِن لوگوں کے ہدایت چھوڑنے اور گمراہی اختیار کرنے کو خرید وفروخت سے بیان کیا گیا۔

''الضلالۃ'' کا معنی: ظلم کرنا، افراط وتفریط میں پڑنا، ہدایت کا گم ہونا۔ یہاں دین سے ہٹ کر بے دینی اختیار کرنا مراد ہے، جس کے معنی گمراہی کے ہیں۔ یہی لفظ جہاں کہیں انبیا کے لیے بولا جائے تو وہاں وارفتگی، یا جذب وغیرہ کے معنی میں ہے۔ جو انبیا کو گم راہ جانے سخت بے دین ہے۔

{بالھدی} عربی زبان میں لین دین کے معاملہ میں ''ب'' اس پر آتی ہے جس کو چھوڑنا مقصود ہو (یعنی: قیمت) تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرلی۔

"رَبِحَتْ": "رِبْح" سے ہے، معنیٰ: نفع۔ اپنی اصل پونجی کے علاوہ جو کچھ حاصل ہو اس کو "منافع" یا "رِبْح" کہتے ہیں۔ "تجارت": خرید و فروخت کے کاروبار کو کہتے ہیں، جو یہ کاروبار کرتے ہیں انھیں "تاجر" کہتے ہیں، جو بھی فروخت کرے اس کو "بائع" کہتے ہیں۔

{وَمَا كَانُوا مُهْتَدِيْنَ} کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں (۱) وہ پہلے سے ہی اس تجارت سے ناواقف تھے، اس لیے نفع تو کیا کماتے، اپنی اصل پونجی ہی کو کھو بیٹھے۔ (۲) وہ اس تجارت میں ہدایت پانے والے نہ ہوئے، یعنی اور تجارتوں میں خوب ہوشیاری سے کام کرتے ہیں، مگر اِس تجارت میں تو ایسے بے وقوف بنے کہ بجائے نفع حاصل ہونے کے اصل مال کو بھی زوال آگیا۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۸۸]

خلاصۂ تفسیر: حق تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عقل ملتی ہے، اور پھر نیک و بد راستے اس کے سامنے ہوتے ہیں تاکہ وہ اپنی عقل سے اچھے راستے کو اختیار کرے اور بُرے راستوں سے پرہیز کرے۔ ان منافقین نے اپنے اندر بُرے اخلاق پیدا کر کے اس نورِ حق کو بجھا دیا اور ہمیشہ کی مصیبتوں کو مول لے لیا، انھوں نے کلمۂ توحید کی صرف یہ قیمت جانی کہ دنیا کا نفع حاصل کیا جائے، حالاں کہ آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں اِن نعمتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تو انھوں نے عقل اور کلمۂ توحید کو دنیا کے لیے خرچ کیا اور پھر اس پر خوش بھی ہوئے۔

اِن کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی قیمتی موتی دے کر مٹی کا کھلونا خرید لے، یا اصلی سونا دے کر ولایتی و نقلی سونا لے لے، تجارت کے اصول سے یہ لوگ بہت گھاٹے میں رہے۔ عقل مند لوگ اپنی عقل، جان مال اور اولاد صرف کر کے سچا ایمان لیتے ہیں اور وہ واقعی بیوپاری ہیں، کیوں کہ فانی کے عوض، باقی حاصل کرتے ہیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۸۹]

فائدے: (۱) بیعِ تعاطی جائز ہے، یعنی: بغیر منہ سے بولے محض لین دین سے کوئی

چیز خریدنا، کیوں کہ منافقین نے اپنے منہ سے خرید وفروخت کے الفاظ نہ کہے تھے، محض ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کی تھی، اس کو قرآن نے خریدنا فرمایا۔ اگر کوئی شخص قیمت دے کے چیز لے لے اور بیچنے والا بھی اس پر راضی ہوجائے تو بیع ہوجائے گی۔

(۲) جو شخص بڑے سے بڑے دنیوی نفع کو چھوڑ کر دینی معمولی نفع حاصل کرے وہ کامیاب تاجر ہے۔ اور اس کا برعکس کرنے والا محض بے وقوف ہے

(۳) جو دینی کام ریاکاری کے لیے کرتا ہے وہ نہایت بے وقوف ہے، کیوں کہ وہ بھی انھیں منافقین میں ہے، جنھوں نے محض مسلمانوں کو راضی کرنے کے لیے کلمہ پڑھا۔ دینی کاموں کی قیمت اللہ ورسول کی رضامندی ہے۔

(۴) جو شخص نوافل ادا کرے اور فرائض وواجبات میں غفلت کرے تو بے وقوف ہے۔

(۵) بمجبوری عبادت کا کوئی ثواب نہیں ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۸۹]

تفسیر صوفیانہ: ہدایت دو ہیں (۱) وہ ہدایت جو عالَمِ ارواح میں مل چکی ہے، جس پر بچہ پیدا ہوتا ہے (۲) دوسری وہ جو اللہ والوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے، جو دونوں پالے نورٌ علی نور ہے۔ جو اس دوسری ہدایت سے محروم رہا اس کی پہلی ہدایت بے کار ہے، جیسے آنکھ کے بغیر آفتاب کا نور مفید نہیں۔ منافقین کو پہلی ہدایت حاصل تھی، لیکن نورِ مصطفائی سے علاحدہ رہے اور تجارت میں کامیاب نہ ہوئے۔

ایک شکاری، باز کے شکار کو گیا، اور تیر باز کی بجائے اس کے سایہ پر چلایا، واپسی پر اپنے دوست سے حال بیان کیا، اس نے کہا، بے وقوف! تو نے سایہ پر تیر مارا، اصل باز تو اوپر تھا۔ منافقین نے دنیا کے لیے سارے تیر استعمال کیے، دین کے لیے نہیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۸۹]

{مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ}

(اُن کی کہاوت اس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اُس سے آس پاس جگمگا اٹھا،

اللہ اُن کا نور لے گیا اور انھیں اندھیریوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سُوجھتا)[البقرۃ:۱۷]

تعلق: پہلے منافقین کے عیوب بیان کیے، اب اُن کو اور زیادہ ظاہر کرنے کے لیے ایک مثال دے کر سمجھایا۔

تفسیر: مثال دو طرح کی ہوتی ہے(۱) فرد کی فرد سے، جیسے زید شیر کی طرح ہے۔ (۲) قصہ کی قصہ سے۔ پہلی قسم کو تشبیہ، دوسری کو مثال کہتے ہیں۔[تفسیر نعیمی ۱/۱۹۱]

''مَثَل '' : مانند، مثَل۔ اصطلاح میں اس کہاوت کو کہتے ہین جو عجیب چیز کے لیے بیان کی جائے، جیسے اردو میں کہتے ہیں '' جس کے نہ نکلی ہو بیائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی'' ۔ یعنی: جو کبھی مصیبت میں گرفتار نہ ہو وہ دوسرے کے درد کو کیا جانے۔ چوں کہ مثالوں سے جاہل لوگ بھی سمجھ جاتے ہیں، دلائل صرف عقل مند لوگوں کے لیے ہیں۔

'' الذی '' یہ لفظ صورۃً واحد اور معنیً جمع ہے۔ یعنی: منافقین، اس جماعت کی طرح ہیں۔

'' استوقَدَ '' : ''وُقُود '' سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں آگ کا بھڑکنا اور اس سے شعلہ اٹھنا، ایندھن کو بھی اس لیے ''وَقُود'' کہتے ہیں کہ اس سے آگ بھڑکتی ہے، یعنی: ان لوگوں نے خوب تیز آگ جلائی اور اُسے بھڑکایا۔

'' نَاراً '': '' نور '' سے بنا ہے، معنی: تڑپنا اور حرکت کرنا، چوں کہ آگ میں بھی تڑپ اور حرکت ہوتی ہے اس لیے اسے '' نار'' کہتے ہیں، چوں کہ آگ میں روشنی بھی ہے اس لیے روشنی کو '' نور'' کہتے ہیں۔ اسی سے ''منارہ'' ہے، کیوں کہ اس سے اذان دی جاتی ہے اور لوگ دور سے دیکھ کر منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔ چونا کو ''نُورہ'' کہتے ہیں کہ وہ بال اڑا کر بدن کو چمکاتا ہے۔ غرضیکہ '' نور'' کا استعمال دو معنی میں ہے(۱) حرکت، تڑپ (۲) روشنی، ظہور، چمک۔

''اَضاءَت '': ''ضوٗ '' سے ہے، تیز روشنی۔

''نور'' اور ''ضؤ'' میں فرق ہے، ''ضؤ'' خوب تیز روشنی کو کہتے ہیں۔ قرآن میں آفتاب کو ''ضیاء''، چاند کو ''نور'' کہا گیا، نیز نبی کریم ﷺ کو بھی ''نور'' فرمایا گیا ہے، ان سے ہر ایک فیض پاتا ہے وہ سورج کی طرح جلالی نہیں ہیں جو کہ آنکھوں کو خیرہ کردے۔

''اَضَاءَتْ'' فعل لازم بھی ہے۔ یعنی: آس پاس کی جگہ چمک گئی۔ اور متعدی بھی ہے، یعنی: پس خوب چمکایا آس پاس کی جگہ کو۔

''حَوْل'' کا معنی گھومنا ہے، اس لیے سال کو ''حَوْل'' کہتے ہیں، کیوں کہ وہ گردش کرتا ہے، اصطلاح میں ملی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔ اس کے معنی بدلنے کے بھی ہیں، اس لیے قرض منتقل کرنے کو ''حوالہ'' کہتے ہیں۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے، یعنی: اردگرد قریب کی جگہ۔

{ذَهَبَ اللّٰهُ} ''ذَهَبَ بِه'' اور ''اَذْهَبَه'' دونوں کا معنی ایک ہی ہے، یعنی: اس کو لے گیا، لیکن ''ذَهَبَ بِه'' وہاں بولا جاتا ہے، جہاں بالکل لے گیا ہو اور واپسی کی امید نہ ہو، ''اَذْهَبَ'' میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے: ''ذَهَبَ السلطانُ بمالہ'' بادشاہ نے اس کا سارا مال ضبط کرلیا، یعنی: کچھ نہ چھوڑا اور واپسی کی امید بھی نہیں، قرآن میں یہی بولا گیا، کیوں کہ اللہ ان کا نور بالکل لے گیا، بجھادیا اور اب اس کے منور ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔

''ذَهَبَ'' کی نسبت اللہ کی طرف ہے، تاکہ معلوم ہو کہ منافقین کی آگ کسی عارضہ سے نہیں بجھی، بلکہ خدا نے بجھادی۔ اب یہ دوبارہ جلا سکیں ممکن نہیں، کیوں کہ خدا نے بجھادیا تو کون جلا سکتا ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۱۹۲]

{بِنُورِهِمْ} ''نور'' کا معنی روشنی، جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے، اس کا مقابل ''ظلمة'' یعنی تاریکی ہے۔ نور کی نسبت منافقین کی طرف اس لیے کی گئی کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کررہے تھے۔

''وَتَرَكَهُمْ '' اس لیے کہا گیا تاکہ معلوم ہو کہ ان کی آگ بالکل بجھادی گئی، جس سے وہ پورے طور پر اندھیرے میں رہ گئے۔

{ظُلُمٰت }:''ظُلْمَة '' کی جمع ہے، لغوی معنی کم ہونا ہے، برف کو اس لیے ''ظلم '' کہتے ہیں کہ وہ کم ہوتا ہے، ستانے کو ظلم کہتے ہیں، اس لیے کہ ظالم کی نیکی ظلم سے کم ہو جاتی ہے۔ دانت کے پانی، اس کی تری، اور اس کی سفیدی کو بھی کہتے ہیں۔ مگر یہاں مراد تاریکی ہے۔

''ظلمات '' جمع اس لیے لائی گئی، کہ منافقین بہت سی تاریکیوں میں گھرے ہوئے تھے (۱) کفر کی (۲) مکروفریب کی (۳) جھوٹ بولنے کی (۴) مسلمانوں پر طعنہ زنی کی (۵) جہل مرکب کی (۶) گناہوں اور شہوتوں کی تاریکیاں۔

{لَّا يُبۡصِرُوۡنَ } یعنی: انھیں اندھیرے میں اس طرح چھوڑ دیا گیا کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۹۲]

خلاصۂ تفسیر: اس مثل میں یہ بیان ہے کہ مدینہ میں ایمان کی روشنی پھیلی تو کچھ لوگوں نے بعد میں دنیاوی منافع کے لیے منافقت شروع کر دی، تو اُ ن کی حالت کو اس جماعت سے تشبیہ دی گئی جو اندھیرے جنگل میں گھر گئی ہو، انھوں نے گرمی اور روشنی وغیرہ کے لیے آگ جلائی اور مطمئن ہو گئے کہ اب نہ بجھے گی، اچانک بجھ گئی۔ اب حیران و پریشان ہوئے لیکن اب اس قابل نہ رہے کہ آگ جلا سکیں۔ ان منافقین کا یہی حال ہے، مسلمانوں کے خوف سے اور نفع کی امید پر بہ ظاہر اسلام قبول کر لیا، احکام بھی جاری ہو گئے، یہ مثل آگ جلانے کی ہے۔ احکام جاری ہوئے یہ اسی آگ کی روشنی ہے۔ منافقین مطمئن ہو گئے کہ جس طرح ہم نے ظاہری کلمہ نماز سے دنیا کا کام نکال لیا، آخرت کا بھی نکال لے جائیں گے۔ یہ اس ظاہری روشنی پر اعتماد ہوا۔ اسی خیال میں تھے کہ اچانک موت نے آدبایا، آگ گل ہو گئی۔ گل ہونا تھا کہ مرتے ہی آنکھ کھل گئی اور زبانِ حال سے یوں کہنے لگے ؂

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ہر انسان تاجر ہے، زندگی مکان، سانس اور زندگی کی گھڑیاں اصلی پونجی، جن کو خرچ کرکے وہ اعمال کے سودے خرید تا ہے۔ نیک اعمال کرنے والے نفع میں ہیں اور بد کرنے والے نقصان میں۔ اور کفر کرنے والے پورے خسارہ میں ہیں۔ جیسے بعض دکانیں دن رات کھلی رہتی ہیں، ویسے ہی بعض لوگ دن رات نیکی کرتے رہتے ہیں، بلکہ وفات کے بعد بھی اُن کی دُکان بند نہیں ہوتی۔

منافقین جب قبر میں گئے تو دیکھا ظاہری چراغ کام نہ آیا، اور لوٹنے کی کوئی صورت نہیں اور نہ ہی کرنے کی۔ یہ آگ کا بالکل ختم ہوجانا اس کی مثال ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۱۹۲]

فائدے: جو چیز نام ونمود کے لیے ہو وہ دنیا ہے، اس کا فائدہ عارضی ہے۔ اور جو حق تعالی کے لیے ہو وہ دین ہے اس کا فائدہ لازوال ہے۔ دکھاوے وغیرہ کی نماز دنیا ہے اور جو کام سنت پر عمل کرکے ہو وہ عینِ دین ہے۔ منافقین کا عمل دنیا ہو کر رہ گیا۔

(۲) کوئی شخص اپنے اعمال پر بھروسا نہ کر بیٹھے، جب تک کہ اس کو خاتمہ بالخیر میسر نہ ہو، اس جگہ اعمال کی بہت ڈکیتیاں ہیں۔ مقولہ ہے: ''ہری ہری کھیتی، گابھن گائے، جب جانو جب منہ تک جائے''۔

(۳) ظاہری اعمال قالب، اور نیت اخلاص مثل قلب ہے، قالب بغیر قلب کے بے کار ہے اور اعمال بغیر صحیح نیت کے بے فائدہ۔

تفسیر صوفیانہ: خالص آگ پائیدار، اس کی گرمی قابلِ اعتبار اور اس کا نور برقرار، جیسے کرۂ نار اور انسانی مزاج کے خلط کی آگ، کہ نہ تو اس کے لیے ایندھن کی ضرورت اور نہ بفضلہٖ تعالی بجھنے کا اندیشہ۔ لیکن غیر خالص آگ نہ تو خود پائیدار، نہ اس کی گرمی کا اعتبار۔ خالص ایمان ان شاء اللہ پائیدار، اس کی حرارت رہنے والی ہے: {يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ} [سورۂ ابراہیم : ۲۷] اللہ تعالی

مسلمانوں کو کلمۂ طیبہ پر زندگی، موت، قبر، حشر میں ثابت رکھے گا۔ اور اسی طرح اس کا نور قبر و حشر میں برقرار رکھے گا: {يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ} [سورۂ حدید: ۱۲]۔ منافقین کا ایمان خالص نہ تھا۔

آفتاب کی شعاعوں سے کپڑا نہیں جلتا، لیکن آتشی شیشے کے ذریعہ جل جاتا ہے۔ اسی طرح توحید کی شعاعیں کفر و فسق کے خرمن کو نہیں جلاتیں، جب تک نبوت کے آتشی شیشہ سے چھن کر نہ آئے، پھر نبوت کی شعاعیں بھی دل کی خواہشات کو نہیں جلاتیں، جب تک کسی ولی کے شیشے میں سے چھن کر نہ آئیں۔ توحید کی تاثیر کے لیے نبوت کی آڑ ضروری ہے، نبوت کی تاثیر کے لیے ولایت کی آڑ ضروری ہے۔ یہ لوگ توحید کے قائل تھے، لیکن نبوت و ولایت سے علاحدہ رہے، اس لیے ان کا نور بجھ گیا۔

الروحُ فداك فَزِدْ حرقا یک شعلہ دگر بر زن عشقا
موراتن، من، دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

عشق کی آگ وہ ہے جو محبوب کے سوا کو جلا ڈالتی ہے۔

{صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ}

(بہرے، گونگے، اندھے ہیں تو وہ پھر آنے والے نہیں) [البقرۃ:۱۸]

تعلق: پہلی آیت میں بتایا گیا کہ منافقین ان کی طرح ہیں کہ جو آگ جلائیں اور ان کی آگ بجھ جائے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ دنیوی آگ بجھنے سے فقط آنکھ بے کار ہوتی ہے، کان زبان پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، لیکن منافقین کی آگ تو ایسی بجھی کہ جس سے ان کے کان، زبان، آنکھ اور دل سب بے کار ہوگیے۔

تفسیر: ''صُمٌّ'' : ''صَمَمٌ'' سے ہے۔ معنی: کان کا بوجھ، اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے (۱) وہ کہ سننے کی طاقت ہی جاتی رہے (۲) جس سے اونچا سنائی دینے لگے۔

''بُكْمٌ'' : ''بَكَمٌ'' سے ہے۔ یہ زبان کی اس بیماری کا نام ہے جس سے حروف ادا

نہ ہو سکیں۔ یہ بھی دو قسم ہے (۱) جس سے حروف بگڑ جائیں (توتلا پن) عقدۂ لسان۔ (۲) جس سے بولنا ہی ممکن نہ ہو (گونگا پن) جس کو "خُرس" کہتے ہیں، دوسرا معنی مراد ہے۔

"عُمْیٌ": "عمی" سے ہے۔ یہ آنکھ کی وہ بیماری ہے جس سے بینائی بالکل ہی جاتی رہے، اندھا پن۔ یہ بھی دو قسم ہے (۱) ایک پیدائشی اندھا ہو (۲) پہلے انکھیارا ہو، بعد میں اندھا ہوا ہو۔ آخری معنی مراد ہے۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں (۱) ایک یہ کہ سرے سے آنکھ ہی نہ ہو، جسے عربی میں "طَمس" کہتے ہیں۔ (۲) آنکھ تو قائم ہو، مگر اس میں روشنی نہ ہو، اس جگہ آخری معنی مراد ہے۔

اس بیماری کی کل چار قسمیں ہیں: (۱) عَمی (۲) طَمس (۳) کمہ (۴) عمہ.

"عمہ" کا معنی دل کا اندھا ہونا۔ اس جگہ "عمی" سے آنکھ اور دل دونوں کا اندھا پن مراد ہے۔

{لَا یَرْجِعُوْنَ}

[وہ پھر آنے والے نہیں]

انسان کے راہِ راست پر آنے کی تین ہی صورتیں ہیں:

(۱) اس کی بینائی قائم ہو، جس سے راستہ دیکھے۔

(۲) اس میں بولنے کی طاقت ہو کہ پکار کے مدد لے سکے۔

(۳) اس کے کان درست ہوں، تاکہ ہادی کی آواز و ہدایت سن کر درست ہو جائے۔

منافقین کی تینوں قوتیں بے کار ہیں تو لوٹنے کی کوئی امید نہیں۔

خلاصہ: مسلمانوں کو شاید امید رہی ہوگی کہ منافقین کبھی تو راہِ راست پر آئیں گے، لہٰذا اُن کو ہدایت بھی کرتے ہوں گے اور نہ آتا دیکھ کر رنجیدہ ہوتے ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس رنج کو دور فرمایا، کیوں کہ ناامیدی بھی راحت ہے۔ فرمایا: اے مسلمانو! یہ بہرے، گونگے اندھے ہیں، مر چکے ہیں، ان کے ایمان کی امید نہ رکھو، یہ کبھی بھی ایمان نہیں

لائیں گے، لہذا مسلمان ناامید ہو کر رنج وغم کی تکلیف سے بچ گئے۔

فائدے: (۱) اللہ کے نزدیک وہی عضو کام کا ہے جو اپنے مقصود کو پورا کرے، جس میں یہ صفت نہیں وہ بے کار ہے۔ چوں کہ زبان حق بولنے، کان حق سننے، آنکھ حق دیکھنے کے لیے عطا فرمائی گئی، اس کے علاوہ جو بھی دنیاوی کام لیے جاتے ہیں وہ سب تابع ہیں، جب ان اعضا نے اپنا اصلی کام نہ کیا تو اُن کو بے کار کہا گیا۔

اولیا و شہدا اگرچہ بہ ظاہر وفات پا چکے ہیں، لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصود پورا کیا ہے۔

(۲) جو حق تعالی کی طرف بخوشی رجوع کرتا ہے، وہ اس کی بارگاہ میں عزت سے بلایا جاتا ہے: {اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً }[یعنی: اے مبارک روح! اپنے رب کی طرف چل کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ سورۂ فجر: ۲۸] جو کہ بخوشی اس طرف رجوع نہیں کرتے، انجام کار ان کو بھی وہیں جانا پڑے گا مگر ہتھکڑی اور بیڑی کے ساتھ۔

تفسیر صوفیانہ: تین چیزیں دل کی آنکھ کو اندھا کرتی ہیں:

(۱) اعضا کو گناہوں میں مشغول رکھنا۔

(۲) ریا سے عبادت کرنا۔

(۳) خالق کو چھوڑ کر خلق سے امید رکھنا۔

یہ بیماری تپِ دق کی طرح ہے، اولا: ہلکی معلوم ہوتی ہے، بعد میں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

آباد وہی دل ہے کہ جس میں تمھاری یاد ہے
جو یاد سے غافل ہوا ویران ہے برباد ہے

[تفسیر نعیمی ۱/۱۹۵]

{ اَوۡ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيۡهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعۡدٌ وَّبَرۡقٌ‌ۚ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِىۡٓ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الۡمَوۡتِ‌ؕ وَاللّٰهُ مُحِيۡطٌۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ }

(یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک، اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں، کڑک کے سبب، موت کے ڈر سے۔ اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے) [البقرۃ:۱۹]

تعلق: پہلے منافقوں کی ایک کہاوت بیان کی گئی تھی، اس آیت سے دوسری بیان ہو رہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہاں آگ جلا کر روشنی کی بات تھی، یہاں سے بجلی کی چمک سے چلنے کی بات ہے۔ وہاں معمولی دہشت تھی، یہاں سخت گھبراہٹ اور پریشانی کا بیان ہے۔ لہذا یہ کہاوت پہلی سے اعلی ہے۔

چند کہاوتوں سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے اصلی چیز ہر ایک کی سمجھ میں آجاتی ہے۔

شانِ نزول: منافقوں میں دو شخص سرکار علیہ السلام کے پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے کہ راستہ میں بارش آگئی جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ اس میں سخت گرج اور چمک تھی، جب گرج ہوتی، کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، کہ کہیں کان پھٹ نہ جائیں، چمک ہوتی تو چلنے لگتے، جب اندھیرا ہوتا تو رک جاتے۔

آپس میں کہنے لگے، شاید گناہ کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت آئی ہے، خدا خیر سے سویرا کرے، چل کر سرکار کے یہاں توبہ کریں گے اور پھر اسلام پر صحیح قائم ہو جائیں گے۔ اس وقت یہ آیت اتری، باقی منافقین کے لیے کہاوت بنایا اور اس قصے کو اُن کی روش پر منطبق کیا۔

تفسیر: ''اَوْ'' شک کی جگہ آتا ہے۔ اردو میں اس کا معنی ''یا'' ہے، مثلاً: کہا جاتا ہے: جیسے زید آیا تھا یا عمر۔ لیکن حق تعالی شک سے پاک ہے، اس لیے اس ''اَوْ'' میں چند احتمال ہیں:

(۱) اختیار کے لیے ہو، جیسے ''لاری میں یا ریل میں'' یعنی: اختیار ہے چاہے جس میں

آؤ۔ معنی یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم کو اختیار ہے، پہلی مثل بیان کرو یا دوسری۔

(۲) منافق دو طرح تھے، بعض آگ والوں کی طرح، بعض بارش والوں کی طرح ہیں۔

{کَصَیِّب} ''صَیِّب'': ''صَوْب'' سے ہے۔ معنی: اترنا، جھکنا، ارادہ کرنا۔ سر جھکانے کو ''تصویب'' کہتے ہیں۔ پہلا مراد ہے، یعنی: بارش، جو اوپر سے اترتی ہے۔ یا بادل جو جھک کر برستا ہے۔

{مِنَ السَّمَاء} ''سماء'': ''سُمُو'' سے ہے۔ معنی: اونچائی، بلندی، آسمان کو ''سماء'' اس لیے کہتے ہیں کہ اونچا ہے۔ بادل کو بھی ''سماء'' کہتے ہیں۔ اگر چہ بارش اوپر ہی سے ہوتی ہے، لیکن ''من السماء'' کہنے سے کئی فائدے ہیں:

(۱) فلاسفہ کی تردید، اُن کے نزدیک سمندر سے بھاپ بن کر اوپر ہو کر بادل بن کر، پھر ٹھنڈک پا کر بارش ہوتی ہے۔ بتایا گیا کہ بارش زمین سے نہیں ہوتی ہے، آسمان سے ہوتی ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے تو بہت دفعہ گرمی ہوتی ہے بارش نہیں ہوتی ہے۔ بعض دفعہ بہت سردی میں بارش ہوتی ہے۔

پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ کبھی بڑی بوندیں، کبھی چھوٹی بوندیں، کبھی برف، کبھی اولا وغیرہ گرتا ہے؟

اگر ان سب سے چشم پوشی کر کے مان لیا جائے تو پھر سمندر کو پانی کہاں سے ملتا ہے؟ لا محالہ کہو گے، آسمان سے۔ روپیہ خزانہ سے ملتا ہے اور خزانہ ٹکسال سے آتا ہے۔ تو یہاں بارش کے ٹکسال کا ذکر ہے۔

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہما سے روایت ہے: عرش کے نیچے دریا ہے، جس سے تمام حیوانات کے رزق اترتے ہیں، رب تعالی کی مرضی سے تمام رزق آسمانوں سے گزرتے ہوئے دنیاوی آسمان کی طرف پہنچتے ہیں۔ بادل مثل چھلنی کے ہے، پانی آسمان سے آتا ہے اور اس سے چھن کر زمین پر۔ ہر قطرہ ایک فرشتہ لاتا ہے، زمین پر رکھتا ہے۔

(۲) ''مِنَ السَّمَاء'' میں اس جانب اشارہ ہے کہ بارش عالم گیر تھی، نہ یہ کہ بعض جگہ تھی اور بعض جگہ نہ تھی۔

(۳) یہ کہ فلاسفہ کے قول کے مطابق اگرچہ بارش زمین کے پانی سے ہوتی ہے، مگر اس کے اسباب آسمان سے بنتے ہیں، کیوں کہ آفتاب کی گرمی سے بھاپ اوپر چڑھتی ہے، وہاں سے ٹھنڈک سے جم کر بادل۔ لہذا بارش آسمان ہی کے ذریعہ ہوتی ہے۔

بقول فلاسفہ گرمی سے پانی بخار بن جاتا ہے اور زمین کے اجزا دھواں، جیسے لکڑی سے دھواں، دیگچی سے بخار۔

زمین کا دھواں جب ہواؤں کے دوش پر اوپر جاتا ہے تو کرۂ آگ تک پہنچ کر روشن ہو جاتا ہے۔ کبھی چند روز روشن رہتا ہے، تو دمدار ستارہ اور نیزہ کی شکل بنتی ہے۔ کبھی جلد بجھ جاتا ہے، جس کو ''شہاب ثاقب'' (ٹوٹا ہوا تارہ) کہتے ہیں۔ کبھی روشن نہیں ہوتا جل جاتا ہے، یہ آسمان کی سرخی و سیاہی ہے۔

بخار جم کر قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گرتا ہے، یہ بارش ہے۔ جمے ہوئے بخار کو بادل کہتے ہیں قطروں کو بارش۔ کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا، زمین سے قریب ہی رہتا ہے اور سردی سے جم کر گر جاتا ہے اس کو شبنم کہتے ہیں۔ کبھی راستہ سے جم کر گر جاتا ہے اس کو اُولا کہتے ہیں۔

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گرمی پا کر بخار، دھواں، غبار مخلوط ہو کر اوپر جاتے ہیں، وہاں جا کر علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ غبار الٹا واپس ہوتا ہے، اس کو آندھی کہتے ہیں۔ اور بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد تک پہنچ جاتے ہیں تو بخار ٹھنڈا ہو کر بادل ہو جاتا ہے، دھواں اس کو چیر کر اوپر جانے کی کوشش کرتا ہے تو سخت آواز پیدا ہوتی ہے، اسی کا نام گرج اور رعد ہے۔ کبھی دھواں تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے اسی کو بجلی اور برق کہتے ہیں۔

کبھی بہت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتا ہے

اور بادل کو چیرتا ہے تو سخت آواز پیدا ہوتی ہے اور زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے، اس کو صاعقہ یعنی: بجلی گرنا کہتے ہیں۔ بعض جگہ یہ بجلی لوہے کی شکل میں ملی ہے یہ وہی پکا ہوا جما ہوا دھواں ہے۔ مگر

دل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے۔

یہ سب عقلی ڈھکوسلے ہیں لیکن حقیقت میں یہ تمام قدرت کے کرشمے ہیں۔

{فیہ ظلمت} ''فیہ'' کی ضمیر ''صیب'' کی طرف لوٹتی ہے۔ بادل معنی ہو تو معنی ہوگا، اس بادل میں بہت تاریکیاں ہیں۔ اور اگر بارش ہو تو معنی ہوگا کہ اس بارش میں بہت تاریکیاں ہیں۔

وہ تاریکیاں یہ ہیں (۱) بادل کی تاریکی (۲) تیز بارش کی تاریکی (۳) رات کی تاریکی (۴) چاندنی نہ ہونے کی تاریکی۔

''رعد'' : بادل کی آواز۔ ''برق'': اس کی چمک کو کہتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ یہ چیزیں بارش میں ہیں تو صحیح ہے، کیوں کہ دونوں کا اور بارش کا تعلق بادل سے ہے۔

ترمذی شریف میں ہے: ایک مرتبہ یہودیوں نے سرکار سے سوال کیا کہ رعد و برق کیا ہے۔ ارشاد ہوا: رعد فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے، یہ آواز اسی فرشتہ کی ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے۔ برق اس کا آتشی کوڑا ہے جس سے ہانکتا ہے۔

روح البیان میں ہے کہ وہ فرشتہ شہد کی مکھی کی شکل کا ہے، عظیم قوت کا مالک ہے، یہ اسی فرشتہ کی تسبیح کی آواز ہے، اس لیے سُن کر تسبیح پڑھنی چاہیے۔

''اصابعھم'' میں یہ سوال ہے کہ انسان کڑک سن کر اپنے پورے کانوں میں لگاتا ہے، نہ کہ پوری انگلیاں؟ جواب یہ ہے کہ انگلیوں سے پورے ہی مراد ہیں۔ یا یہ کہ پوری انگلیاں خوف کی وجہ سے ٹھونسنے کی کوشش کرتے۔

''الصواعق '': '' صاعقه ''کی جمع ہے، اس بجلی کو کہتے ہیں جو گر کر جلا ڈالتی ہے۔

{حَذَرَ الْمَوْتِ} ''حذر '': ڈر، پرہیز، بچنا۔ یعنی: موت کے ڈر کی وجہ سے، یا موت سے بچنے کے لیے۔

{واللّٰه محیط بالکٰفرین} اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

''محیط '':''اِحاطه '' سے ہے۔ کسی چیز کے آس پاس اس طرح سے گھیرا ڈالنا کہ وہ بالکل درمیان میں آجائے۔ اور یہ بات حق تعالی کے لیے ممکن نہیں ہے، کیوں کہ وہ جگہ وغیرہ سے پاک ہے۔ اس لیے معنی ہوں گے کہ حق تعالی کا علم وقدرت اُن کو گھیرے ہوئے ہے۔

''بالکٰفرین '' وہ صرف کافروں ہی کو محیط نہیں، بلکہ سب کو ہے، لیکن چوں کہ کافروں کا ذکر ہو رہا ہے اس لیے ان کا ذکر کیا گیا۔

خلاصه: منافقین کی حالت اس جماعت کی طرح ہے جو سنسان بیابان جنگل میں ہوں اور کالا بادل، سخت اندھیرا چھا جائے، تیز بارش ہو، بجلی کڑک ہو اور اُن کو اپنی موت کا اندیشہ ہونے لگا جس سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لگیں کہ کہیں کان کا پردہ نہ پھٹ جائے، بجلی کی روشنی میں چلیں، اندھیرا ہونے پر رُک جائیں، کش مکش میں ہیں، کیا کریں، کیا نہ کریں۔ یہی حال منافقین کا ہے کہ اپنی زندگی کی اندھیری رات میں دنیا کا جنگل طے کر رہے تھے اچانک رسول اللہ ﷺ تشریف لائے جو رحمتِ الٰہی کا گہرا بادل ہیں۔ آپ پر قرآن مجید اترنے لگا، جو تیز بارش کے مثل ہے، بارش تمام زمین کو سیراب کرتی ہے، اسی طرح قرآن دلوں کی کھیتی میں ایمان کی ہریالی پیدا کرتا ہے۔ جرموں کی سزا، گرج چمک کے مثل ہے جس سے کانوں میں انگلیاں ڈالتے ہیں کہ کہیں سن نہ لیں اور یہ اثر کر جائے اور اس طرح ان کے عیش وآرام میں فرق آجائے۔ [تفسیر نعیمی ۱/۲۰۰]

{يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ }

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی نگاہیں اُچک لے جائے گی، جب کچھ چمک ہوئی اُس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو اُن کے کان اور آنکھیں لے جاتا، بے شک اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ [البقرة ۲۰۰]

''یکاد'': ''کَود'' سے ہے، معنی: قریب ہونا۔ یہ وہاں استعمال ہوتا ہے کہ کام ہوا تو نہ ہو، لیکن ہونے کا قوی اندیشہ یا امید ہو۔ بجلی نے ان کو اندھا تو نہ کیا، مگر اُن کو اس کا سخت اندیشہ ہوگیا۔

''یَخطَفُ'': ''خَطْف'' سے ہے، اچانک چھین لینا (اُچک لینا)۔ ''ابصار'': ''بَصَر'' کی جمع ہے، آنکھ کی روشنی۔ وہ اگر چہ ایک ہوتی ہے، لیکن بہت سارے لوگوں کا ذکر ہے اس لیے جمع لایا گیا۔ تیز روشنی آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے، بجلی بھی تیز روشنی ہوتی ہے، جس سے اندھا ہونے کا قوی اندیشہ ہوجاتا ہے۔

''اَضاءَ'' لازم و متعدّی دونوں ہے۔ یعنی: جب کبھی ان کے سامنے بجلی چمکتی ہے، یا جب کبھی راستے کو چمکاتی ہے۔

''مشوا'': ''مَشْی'' سے ہے، آہستہ آہستہ چلنا، لپک کر چلنے کو عربی میں ''خَبَبَت'' کہتے ہیں، دوڑنے کو ''هَرْوَلة''۔ یعنی وہ لوگ روشنی میں بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے، وحشت نے اُن میں بھاگنے کی صلاحیت نہ رہنے دی تھی۔

''اَظْلَمَ'' لازم و متعدّی دونوں ہے۔ یعنی: جب بجلی تاریک ہوجاتی، یا جب راستے کو تاریک کردیتی۔

''قاموا'': ''قیام'' سے ہے، کھڑا ہوجانا، یا کھڑا رہ جانا، بیٹھنے سے اٹھنے کو کھڑا ہوجانا اور چلتے چلتے رک جانے کو کھڑا رہ جانا کہتے ہیں۔

{وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ} یعنی: اُن کی یہ تدبیریں بے کار ہیں، حق تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ ان کی آنکھیں محفوظ ہیں، ورنہ وہ قادر ہے کہ گرج اور چمک سے ان کی آنکھ اور کان بے کار کردے، خواہ وہ اپنے کان میں انگلیوں کی بجائے کہنیاں ٹھونس لیں۔

''سمع'' : سننے کی قوت کو کہتے ہیں اور اس عضو کو بھی جس میں یہ قوت محفوظ ہے۔

''ابصار'': ''بصر'' کی جمع ہے، دیکھنے کی قوت کو یا وہ تل جس میں قوت محفوظ ہے، چوں کہ تل دونوں کے جداگانہ ہیں اس لیے جمع لایا گیا۔ اور کانوں کے پٹھے ایک ہی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کے دیکھنے سننے کی طاقت زائل کردیتا، یا اُن کے کان کے پردے پھاڑ دیتا اور آنکھوں کا تل زائل کردیتا۔

''اِنَّ'' کا محل وہ ہے جہاں کلام کا کوئی منکر موجود ہو یا کلام کے انکار کا احتمال ہو۔ چوں کہ عرب کے مشرکین حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے منکر تھے اور آئندہ اسلام میں بھی اس کے منکرین پیدا ہونے والے تھے اس لیے یہاں ''اِنَّ'' ارشاد فرمایا گیا۔ مشرکین چوں کہ چند معبود مانتے تھے اس لیے وہ خدا کو ہر چیز پر قادر نہ مانتے تھے، کیوں کہ جو مجبور ہوگا اسی کو مدد کی ضرورت پڑے گی، جو خود قادر ہو اس کو ضرورت نہیں۔

عیسائیوں اور یہودیوں نے حق تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کیا اور مجبور ہی اولاد کا محتاج ہوتا ہے۔ آریوں نے روح و مادہ کا محتاج مانا۔ معتزلہ نے خود بندوں کو اپنے کاموں کا خالق مانا۔ غرضیکہ بہت فرقے قدرتِ الٰہیہ کے منکر ہیں۔

''شیء'': چاہنا، اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں جس کا تعلق چاہنے سے ہو، اردو میں اس کا ترجمہ چیز ہے، تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

''شی'' چار معنوں میں مستعمل ہے:

(۱) ممکن موجود، جیسے: {خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ}، کیوں کہ مخلوق موجود ہی ہے نہ کہ

غیر موجود۔

(۲) ممکن، خواہ موجود ہو یا نہ ہو، جیسے: {اِنَّ اللہ علی کل شیءٍ قدیر} یعنی: خدائے تعالی ہر چیز پر قادر ہے جو اس کے ارادے اور چاہنے میں آسکے، اور وہ ممکنات ہی ہیں، کیوں کہ محال وواجب اس کے ارادے میں آہی نہیں سکتے، لہذا وہ قدرت میں داخل نہیں۔ اس لیے پروردگار نہ تو اپنا شریک بناسکتا ہے، کیوں کہ وہ محال ہے۔ اور نہ ہی خود عیوب سے متّصف ہوسکتا ہے، کیوں کہ یہ بھی محال ہے۔ اور نہ خود اپنی ذات وصفات پر قادر ہے، کیوں کہ وہ واجب ہے، لہذا اس ''شی'' سے محال وواجب دونوں خارج ہیں۔

(۳) بمعنی معلوم، جیسے: {وَکَانَ اللہُ بِکُلِّ شَیءٍ علیما} [سورۂ احزاب:۴۰] اس میں واجب، محال اور ممکن سب داخل ہیں، کیوں کہ وہ سب کو جانتا ہے۔

(۴) بمعنی موجود، خواہ واجب ہو یا ممکن، جیسے: {قُلْ اَیُّ شَیءٍ اَکْبَرُ شَھادۃً قُلِ اللہُ} [سورۂ انعام:۱۹] اور جیسے: {کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ} [سورۂ قصص:۸۸] ان آیتوں میں ''شی'' بمعنی موجود ہے، حق تعالی بھی اس میں شامل ہے۔ دیو بندیوں نے خدا تعالی کے لیے جھوٹ مانا۔

''قَدِیْر'' ''قَدَر'' سے ہے، معنی: اندازہ لگانا اور قادر ہونا۔ دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ خدا تعالی ہر چیز کو اندازے سے پیدا کرتا ہے، نہ کہ زائد، لہذا اندازہ فرمانے والا ہوا۔ کسی چیز سے مجبور نہیں، لہذا ہر شی پر قدرت رکھنے والا بھی ہے۔

قادر اور قدیر کا فرق: ''قادر'' اسم فاعل ہے اور ''قدیر'' صفت مشبہ ہے۔ اسم فاعل اس پر بولتے ہیں جس سے فعل صادر ہو رہا ہے۔ اور صفت مشبہ اس کے لیے بولا جاتا ہے جس میں فعل کرنے کی صفت موجود ہو۔ لہذا ''سامع'' اسے کہا جائے گا جو فی الحال سُن رہا ہو۔ اور ''سمیع'' وہ ہے جس میں سننے کی قوت موجود ہو، خواہ فی الحال سن رہا ہو یا نہیں۔ ''سمیع'' کا مقابل بہرا ہے۔ ''متکلّم'' وہ ہے جو فی الحال بول رہا ہو، اس کا مقابل ''ساکت''

ہے۔ اور "کلیم" وہ ہے جس میں بولنے کی طاقت موجود ہو، اس کا مقابل گونگا ہے۔ لہذا حق تعالیٰ ہمیشہ سے قادر ہے، خواہ مقدورات یعنی: عالم موجود ہو یا نہ ہو۔

خلاصہ: منافقین حضور علیہ السلام کے معجزات وآیاتِ قرآن جو چمکتی ہوئی روشنی کے مانند تھے ان کا مجبوراً اقرار و تصدیق کر کے کچھ دنوں تک چلتے، پھر شکوک و شبہات کی تاریکی میں ڈوب جاتے، حیران و پریشان، نہ آتے بنے، نہ جاتے بنے۔

حضور علیہ السلام نبوت کے آسمان، قرآن بادل، احکامِ قرآن بارش، عذاب کی آیتیں گرج، دنیاوی سزا کی آیتیں برق، جن سے صحابہ خوش اور منافق گھبرائے ہوئے اور پریشان ہیں۔ [تفسیر نعیمی ار۲۰۴]

انسان کو جسمانی و روحانی سایہ کی ضرورت ہے، گرمی، سردی اور بارش سے بچنے کے لیے سایہ کا محتاج ہوتا ہے۔ بچے ماں باپ کے، رعایا بادشاہ کے، شاگرد استاذ کے سایہ کا حاجت مند ہے، اسی طرح امتی قبر میں حشر میں حضور علیہ السلام کے سایہ کے محتاج ہیں۔

خیال رہے کہ جنگل کا مسافر بارش، بادل اور گرج سے گھبراتا ہے، گھر والے گھر میں خوش ہوتے ہیں۔ سایہ والوں کے لیے بادل رحمتِ الٰہی اور بے سایہ والوں کے لیے عذاب ہے۔

فائدے: (۱) اسباب کی تاثیر رب کے ارادے پر موقوف ہے، اگر نہ چاہے تو کسی چیز کا کچھ اثر نہ ہو۔

(۲) حق تعالیٰ کا ارادہ کسی سبب کا محتاج نہیں، بغیر سبب بھی کر سکتا ہے، جیسے یہاں بجلی گرج تیز تھی، مگر اُن کی آنکھ، کان سلامت رہے، کیوں کہ حق تعالیٰ نے اُن کو اندھا کرنا نہ چاہا، چاہتا تو بغیر سبب کے کر سکتا تھا۔

(۳) آج بھی جو لوگ عبادت و ریاضت، آرام اور عیشِ دنیوی کے لیے کرتے ہیں سخت غلطی پر ہیں۔ بعض کو کوئی نقصان ہو گیا تو نماز چھوڑ دی کہ پھلتی نہیں۔ اگر چہ نیک کاموں سے بلائیں ٹل جاتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیکوں پر دنیاوی مصیبت نہیں آتی ہے،

ایسا ہوتا تو صحابہ کرام اور امام حسین رضی اللہ عنہم پر کوئی تکلیف نہ آتی۔

صوفیہ فرماتے ہیں کہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے نماز نہ پڑھو، محض جنت کے لیے نماز پڑھنا ٹھیک نہیں ہے، جنت تو رب کے فضل سے ملے گی، نماز وغیرہ رب کو راضی کرنے کے لیے ہیں، تاجر نہ بنو بلکہ عفو کے امیدوار بنو۔

(۴) ایمان اطمینان سے حاصل ہوتا ہے، نیز حضور ﷺ کو ماننے کا نام ایمان ہے، نہ کہ جاننے کا، مشرکین کے بارے میں ارشاد ہے:

{یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ} [سورۂ بقرہ:۱۴۶]

وہ حضور کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ [تفسیر نعیمی ۲/ ۴۳]

تفسیر صوفیانہ: طریقت کے مسافر کو بھی یہ مصیبتیں پیش آتی ہیں، جو شخص اس راستہ میں قدم رکھتا ہے، اس کو اولاً کچھ محنت کے بعد تجلی حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہو کر خوب آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، پھر اچانک بند ہو جاتی ہے تو گھبرا جاتا ہے اور اس کی ہمت ٹوٹنے لگتی ہے، اگر مستقل مزاج ہے تو ان حالتوں کی پرواہ کیے بغیر کوشش جاری رکھتا ہے، ورنہ تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور تھک کر بیٹھنا ہی محرومی ہے۔

طالبِ مولی پر لازم ہے کہ حالات کی پروا نہ کرے اور کام کیے جائے۔ اور یہ بھی خیال رکھے کہ یہ دشوار گزار راستہ ہے اور سخت کٹھن منزل، اس بھنور میں ہزاروں کشتیاں لٹ گئی ہیں۔ صوفی ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا، کبھی دنیا کی خبر رکھتا ہے اور کبھی اپنے سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ ولی پر فیض کبھی زیادہ، کبھی کم اور کبھی کچھ روز کے لیے بند بھی ہو جاتا ہے، نبی کریم علیہ السلام پر بھی وحی یکساں نہ آتی تھی، کبھی کبھی چند روز کے لیے بند بھی ہو جاتی تھی، لہذا اس راستے کی ان مصیبتوں کی پرواہ نہ کرے۔

مسئلہ امکانِ کذب: جھوٹ تمام عیبوں سے بد ترین عیب ہے، جس کی چند وجہیں ہیں:

(۱) انسان بغیر جھوٹ کوئی گناہ نہیں کر سکتا۔

(۲) کوئی گناہ کفر نہیں، مگر جھوٹ کفر اور شرک کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہے، مشرک کہتا ہے رب دو ہیں۔ عیسائی کہتا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام رب کے بیٹے ہیں۔ شرابی، زانی حرام کہتے ہوئے کرتا ہے تو گناہ ہے کفر نہیں، ہاں، جس نے حلال سمجھا کفر ہو گیا۔

(۳) قرآن میں جھوٹے پر لعنت کی گئی ہے: {لَعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ}[آل عمران:۶۱] ظالم پر لعنت ہے۔ کافر پر جو لعنتیں آتی ہیں وہ بھی جھوٹ کی وجہ سے۔ جھوٹا لعنت کا مستحق ہے۔

(۴) جھوٹا آدمی چھچھورا ہوتا ہے جو حکومت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہر حال جھوٹ تمام عیبوں میں بدترین عیب ہے۔

خدا تعالی کے جھوٹ سے پاک ہونے کے دلائل:

چوں کہ جھوٹ عیب ہے، بلکہ تمام عیبوں سے بدتر ہے، حق تعالی تمام عیبوں سے پاک ہے، لہذا جھوٹ سے بھی پاک ہے۔ خیال رہے کہ جس طرح وہ دوسرے عیوب، چوری اور زنا وغیرہ سے پاک ہے۔ اور جیسے یہ سب اس کے لیے محال بالذات ہیں، جھوٹ بھی اس کے لیے محال بالذات ہے۔

(۲) جب کسی کلی کے دو ہی فرد ہوں، تو ہر ایک کا حکم دوسرے کے لحاظ سے ہوگا، خبر کی دو ہی قسمیں ہیں (۱) سچ (۲) جھوٹ۔ لہذا اگر خدا کی خبروں میں جھوٹ کی گنجائش ہو تو سچ واجب نہ رہا، سچا ہونا واجب نہ رہا، جھوٹ کے امکان سے سچ کی ضرورت ختم ہو گئی۔

(۳) خدا کی تمام صفتیں واجب ہیں، اگر جھوٹ کا احتمال ہو گا تو سوال پیدا ہو گا کہ وہ جھوٹ خدا کی صفت بنے گا یا نہیں، اگر صفت ہے تو اس کو واجب ہونا چاہیے تھا اور اگر صفت نہیں تو امکان کا کیا معنی؟

(۴) کلامِ صادق خدا کی صفت ہے، جب خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہوا تو سچ بھی واجب نہ

رہا، تو لازم آیا کہ ممکن خدا کی صفت ہے۔

(۵) جھوٹ بولنے کی صرف تین وجہیں ہوتی ہیں (۱) بے علمی (۲) عاجزی (۳) اور خباثت۔ اگر کسی شخص کو خبر ملی، اس نے وہی لوگوں سے بیان کردی تو بے خبری میں جھوٹ کہہ دیا۔ زید نے وعدہ کیا کہ ایک ماہ میں روپیہ ادا کردوں گا، مگر اس مدت میں اس کے پاس روپیہ نہ ہوا، جھوٹا وعدہ ہو گیا۔ جو مجبوری کی وجہ ہے۔ کسی شخص کو جھوٹ بولنے کی عادت ہوگئی، وہ ویسے ہی جھوٹ بولا کرتا ہے، یہ جھوٹ خباثتِ نفس کی وجہ سے ہوا۔ لیکن خدائے تعالیٰ اِن تینوں عیبوں سے پاک ہے، لہٰذا جھوٹ سے بھی پاک ہے۔

(۶) کوئی چیز خدا کے مثل نہیں ہو سکتی، خدا کی شان سب سے ارفع و اعلیٰ ہے، انبیائے کرام کی ذات سے جھوٹ کا ہونا ممکن بالذات اور محال بالغیر ہے۔ اگر رب تعالیٰ کا جھوٹ بھی ایسا ہی ہو تو معاذ اللہ اس وصف میں انبیائے کرام اس کے مثل ہو گئے۔

(۷) جس کلام میں جھوٹ کا احتمال ہو، سننے والے کو اعتبار نہیں ہوتا، اگر خدا کی خبروں میں جھوٹ کا احتمال ہو تو اس کی کوئی خبر یقینی نہ رہی، اور بغیر یقین ایمان حاصل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ اس کی ہر خبر میں جھوٹ کا امکان نظر آئے گا اور وہ یقین جو ایمان کے لیے ضروری ہے اس کو حاصل نہ ہوگا۔

(۸) بعض چیزیں بندوں کے لیے کمال ہیں اور رب کے لیے عیب، جیسے: کھانا، پینا، عبادت کرنا۔ یہ بھی حق تعالیٰ کے لیے محال بالذات ہیں۔ اور جھوٹ اول نمبر کا عیب بندوں کے لیے ہے تو رب کے لیے کیوں کر ممکن ہوگا۔

(۹) دیوبندیوں میں بھی منطق داں لوگ موجود ہیں وہ اس مسئلے کے قائل نہ ہوئے اور سارے منطقیوں نے اس مسئلہ کی تردید کی ہے چناں چہ عبد اللہ ٹونکی اور علامہ فضل حق خیر آبادی نے اس کی تردید میں رسالے لکھے، دیوبندیوں کا ممتاز منطقی عبد الوحید سنبھلی یہی کہا کرتا تھا کہ ہمارے علما سے سخت غلطی ہوگئی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ

کس قدر بے ہودہ ہے۔

سوال(۱) اگر خدائے تعالیٰ جھوٹ پر قادر نہ ہو تو مجبور ہوگا اور یہ اس کی الوہیت کے خلاف ہے۔

جواب: مجبوری اسے کہتے ہیں کہ جہاں مفعول میں اثر قبول کرنے کی قابلیت ہو، مگر فاعل میں اثر کی طاقت نہ ہو، اگر خود مفعول ہی اثر نہیں لے سکتا تو یہ قصور مفعول کا ہے نہ کہ فاعل کا۔ اگر کوئی روشنی میں قریب کی چیز نہ دیکھے تو اندھا ہے، لیکن اندھیرے یا بہت دور کی چیز نہ دیکھے تو اندھا نہیں ہے، کیوں کہ یہاں اس کی آنکھ کا قصور نہیں ہے، بلکہ قصور اس چیز کا ہے، کہ اس کے دیکھنے کے قابل نہ رہی۔ اسی طرح خود عیوب اس قابل نہیں کہ خدا کی قدرت میں داخل ہوں، لہذا یہ قصور ان عیوب کا ہے، نہ کہ قدرت کا۔ اگر اسی کا نام مجبوری ہوتا تو تمھارے نزدیک بھی خدائے تعالیٰ بہت سے عیوب پر قادر نہیں، جیسے: موت وغیرہ۔

سوال(۲) جھوٹ بھی ایک شے ہے اور ہر شے خدا کی قدرت میں داخل ہے؟

جواب: خدا کا جھوٹ شے نہیں، کیوں کہ وہ محال ہے اور بندوں کا جھوٹ شے ہے، خدائے تعالیٰ اس کے پیدا کرنے پر قادر ہے، نہ کہ خود اس سے موصوف ہونے پر، کیوں کہ سارے عیب خدا کی مخلوق ہیں، مگر خدا ان سب سے پاک ہے۔

سوال(۳) خدا کی خبریں بھی خبریں ہیں، اور خبر اسی کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ اور سچ کا احتمال ہو، اگر جھوٹ کا احتمال نہ ہوگا تو سچ کا امکان بھی نہ رہے گا۔ لہذا اس کی خبر کو خبر ماننے کے لیے ان میں جھوٹ کا امکان مانو، مگر چوں کہ خدا کی خبریں ہیں، اس لیے جھوٹی ہوگی ہی نہیں۔ لہذا ان خبروں کا جھوٹا ہونا ممکن بالذات اور محال بالغیر ہے۔

جواب: مطلق خبر جنس ہے، اور حق تعالیٰ کی خبر اس کی نوع، اس نوع میں حق تعالیٰ کی نسبت مثل فصل کے ہے۔ فصل کے ذریعہ نوع پر جو احکام جاری ہوتے ہیں وہ سب ذاتی

ہوتے ہیں، ہاں جنس کے عارضی۔ جیسے: ناطق کے احکام انسان کے لیے ذاتی، اور حیوان کے لیے عارضی۔ لہذا جب نسبتِ الٰہی نے جھوٹ کو محال کیا تو محال ہونا رب کی خبر کے لیے بالذات اور مطلق خبر کے لیے بالعرض ہوا۔

سوال(۴) حق تعالیٰ کے سچے ہونے کی تعریف جب ہی ہو سکتی ہے، یا کی جا سکتی ہے، جب کہ وہ جھوٹ پر قادر ہو، مگر نہ بولے۔ اگر اس کو جھوٹ پر قدرت نہ ہو تو پھر سچے ہونے میں کیا کمال ہے؟ جیسے: دیوار کے جھوٹ نہ بولنے کی تعریف نہیں کی جا سکتی، اس لیے کہ اس میں بولنے کی طاقت ہی کہاں ہے؟

جواب: کیا خوب قاعدہ ایجاد کیا! خدا کے فنا نہ ہونے کی تعریف، جھوٹ نہ بولنے کی تعریف، سارے عیبوں سے پاک ہونے کی تعریف جب ہی کی جا سکتی ہے کہ وہ ان سب پر قادر ہو۔۔ گویا سارے عیب خدا کے لیے ممکن ہوں، کیوں کہ بغیر امکان خدا کی تعریف ناممکن ہے۔ جناب! حق تعالیٰ کی تعریف اس طرح کی جائے گی کہ کسی عیب کی رسائی ہی وہاں تک نہ ہوئی۔ دیوار کا کلام نہ کرنا محال بالغیر نہیں، محال عادی ہے، انبیا سے کلام، اولیا سے کلام کیا ہے، اور کریں گے۔ اور اس قاعدہ سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ کا جھوٹ محال بالغیر تو کیا، محال عادی بھی نہ ہو؟ تاکہ اس کی تعریف کی جا سکے۔

سوال(۵) یہ سب مانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی وعیدوں کے خلاف ہو سکتا ہے، مثلاً: اس نے وعدہ کیا کہ مسلمان کو ظلماً قتل کرنے والے قاتل کی سزا جہنم ہے، لیکن سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اگر چاہے تو قاتل کو جہنم میں نہ بھیجے اور یہی جھوٹ ہے۔

جواب: معاذ اللہ! اس کو جھوٹ سے کیا تعلق؟ اس کی ساری وعیدیں اس کے ارادے پر موقوف ہیں۔ اگر وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے، قرآن میں ہے: {وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ یَّشَآءُ} [سورۂ نساء: ۴۸] شرک کے سوا تمام وعیدوں کو رب کے چاہنے پر موقوف کر دیا، لہذا جس گنہ گار کی بخشش ہوگی اسی مضمون کا ظہور ہوگا۔

قصور معاف کرنا کرم ہے ،نہ کہ عیب ،اور جھوٹ عیب ہے۔

پھر یہ اعتراض توتم پر بھی پڑتا ہے ،کیوں کہ تم رب کے جھوٹ کو محال بالغیر مانتے ہو اور وعید کی مخالفت واقع ہے ،اب اگر یہ کذب ہے توتم خدا کے کذب کو واقع مانو نہ کہ محال بالغیر۔

سوال(۶) رب کا ارشاد ہے: {وَما کانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِم}[سورۂ انفال: ۳۳] یعنی: اے نبی! ہم آپ کے ہوتے ہوئے کفارِ مکہ پر عذاب نہ بھیجیں گے۔ اور پھر خود ہی فرمایا: {قُلْ ھُوَ القادِرُ عَلیٰ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذاباً مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتَ اَرْجُلِکُمْ}[سورۂ انفال:۶۵] یعنی: اے کفار مکہ! خدا قادر ہے کہ تم پر اوپر یا نیچے سے عذاب بھیجے۔

دیکھو! وعدہ عذاب نہ بھیجنے کا تھا اور یہاں فرمایا گیا کہ عذاب بھیجنے پر قادر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ اپنا وعدہ توڑنے پر قادر ہے اور یہی جھوٹ ہے۔

جواب: عالم کی ہر چیز کا ہونا حق تعالیٰ کے ارادے پر موقوف ہے، ارشاد ہے: {فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ}[سورۂ ہود: ۱۰۷] کفار پر عذاب آنا چوں کہ عالم کی ایک چیز ہے لہذا ممکن ہے اور رب تعالیٰ اس پر قادر ہے اور اسی امکانِ قدرت کا ذکر تمھاری پیش کردہ دوسری آیت میں ہوا۔ لیکن جب عالم کی کسی چیز کا حق تعالیٰ کے ارادے سے تعلق ہو جائے تو اب اس کے خلاف ہونا محال بالذات ہے، اس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔

خلاصۂ جواب یہ ہے کہ کفارِ مکہ پر عذاب کا آنا اور نہ آنا اپنے لحاظ سے دونوں ممکن ہے، لیکن اس اعتبار سے کہ عذاب نہ آنے کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا اور اس کے وعدے کے خلاف ہونا محال بالذات ہے، لہذا اس حال میں عذاب کا ہونا محال بالذات ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زید کھڑے ہونے اور بیٹھنے دونوں پر قادر ہے، مگر جب کھڑا ہو گیا تو کھڑے ہونے کی حالت میں بیٹھنا محال بالذات ہے، کیوں کہ وہ اجتماعِ ضدین کا فرد ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ سب کچھ پیدا کرنے اور فنا کرنے پر قادر ہے، لیکن پیدا ہونے کی

حالت میں فنا ہونا محال بالذات ہے اس طرح کہ ہستی ونیستی جمع ہو جائے۔ ہاں! جب ہستی کی جائے تو نیستی فنا ہو جائے گی، دو نقیضوں کا یہی حال ہے کہ ان میں سے ہر ایک ممکن، لیکن ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے کا ہونا محال بالذات ہے۔

کنواری لڑکی جس مسلما ن سے چاہے نکاح کرلے، یعنی بطریق بدایت ہر مسلمان کے نکاح میں آسکتی ہے۔ مگر جب ایک سے نکاح کرلیا تو دوسرے سے اس حال میں نکاح کرنا شرعًا محال بالذات ہو گیا۔ زید کے پیدا ہونے سے پیشتر ہر شخص اس کا باپ بن سکتا ہے، مگر جب وہ بکر کے نطفے سے پیدا ہو چکا اور بکر اس کا باپ بن چکا تو اس حالت میں کسی اور کا باپ بننا محال بالذات ہے کہ حق تعالی قادر نہیں کہ کسی اور کو زید کا باپ بنادے۔

کذب جب ہوتا ہے کہ حق تعالی ارادہ کے باوجود عذاب بھیجنے پر قادر ہوتا۔ تعددِ امکان اور چیز ہے اور امکانِ تعدد اور چیز۔ اس عذاب بھیجنے میں امکان کا تعدد ہے نہ کہ تعدد کا امکان۔

یہ کون کہتا ہے کہ عالم کی بعض چیزیں ممکن ہیں اور بعض ناممکن! نقیضین، ضدین سب ممکن، لیکن اُن کا جمع ہونا محالِ بالذات ہے۔

سوال (۷) یہ مسلّم ہے کہ جو مقدور العبد ہے مقدور اللہ ہے۔

جواب: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ جس کے کسب پر بندہ قادر ہو رب تعالی اس کے خلق پر قادر ہے۔

سوال (۸) (امکانِ نظیر) خدائے پاک قادر ہے کہ ہزاروں محمد بنادے، اہلِ سنت جو کہتے ہیں کہ اب نئے نبی کا آنا محال بالذات ہے غلط ہے، اسی طرح یہ جو کہتے ہیں کہ حضور کا مثل ناممکن ہے غلط ہے جس نے ایک محمد پیدا کیا کیا وہ لاکھوں محمد نہیں بنا سکتا؟

جواب: دیوبندی فوج میں تھمنا کہاں
گنگا کی موج میں جمنا کہاں

یہ مسئلہ "امکانِ نظیر" ہے، جو امکانِ کذب کی شاخ ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں:
(۱) ایک حضور علیہ السلام کے بعد نئے پیغمبر کا آسکنا۔ (۲) حضور کے مثل ہو سکنا۔

پہلے کا جواب گزرا کہ حق تعالی اس پر قادر تھا کہ لاکھوں میں جس کو چاہتا خاتم النبیین بنادیتا، یعنی: بطریقِ ہدایت لاکھوں کا خاتم النبیین بنانا ممکن تھا، لیکن جب نبی کریم علیہ السلام کا انتخاب ہوگیا اور حضور خاتم النبیین بن کر آگئے تو اب کسی نبی کا خاتم بننا محال بالذات ہے۔ جیسے ہر شخص ہندہ کا شوہر اور زید کا باپ بن سکتا ہے، مگر جب ایک بن گیا تو دوسرے کا بننا محال بالذات ہے۔

دوسرے مسئلہ کے تفصیلی جواب کے لیے رسالۂ مبارکہ "امتناع النظیر" کا مطالعہ کیا جائے۔ مختصر اً عرض ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دو نقیضوں اور دو ضدوں کا جمع ہونا محال بالذات ہے، اور حضور ﷺ کا مثل ماننے سے یہ دونوں باتیں لازم آئیں گی، وہ اس طرح کہ حضور آخری نبی، حضور کا دین آخری دین اور حضور کی کتاب آخری کتاب ہے۔ اب اگر کوئی حضور کی طرح ہو تو اجتماعِ ضدین ہوا، کہ آپ اگر آخر تو دوسرا آخر نہیں۔

اسی طرح حضور سب سے پہلے شفاعت کرنے والے، رب سے کلام کرنے والے، پل صراط سے گزرنے والے، جنت میں جانے والے ہیں۔ سب سے پہلے حضور کی قبر کھلے گی۔ اب اگر کوئی حضور کے مثل ہو تو حضور اوّل نہ رہے۔ سب سے پہلے حضور کا نور پیدا ہوا، سب سے پہلے حضور نے "بلی" کہا۔ اگر کوئی مثل ہوگا تو اولیتیں جمع نہ ہوں گی اور حضور اول نہ ہوں گے۔

حضور تمام اولادِ آدم کے سردار ہیں، سارے انبیا قیامت میں حضور کے جھنڈے تلے ہوں گے، حضور سارے انسانوں کے خطیب ہوں گے، روتوں کو ہنسانے والے، گرتوں کو سنبھالیں گے، جلتوں کو بجھائیں گے، بگڑوں کو بنائیں گے، ساری آنکھیں حضور کا منہ تکیں گی، سارے ہاتھ حضور کے دامن کی طرف بڑھیں گے، حضور کو مقامِ محمود ملے گا۔ حضور کا وسیلہ

اعلی، حضور سارے لوگوں کے نبی ہیں، ارشاد ہے:

{ رسولُ اللہِ اِلَیکُمْ جَمِیْعا} [سورۂ اعراف:۱۵۸]۔

اب اگر کوئی حضور کے مثل ہو تو یہ صفتیں اس میں ہوں گی تو اجتماعِ نقیضین لازم آئے گا۔

حق یہ ہے کہ حق تعالی خالقیت میں وحدہ لا شریک ہے، اسی طرح ان اوصاف میں حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم وحدہ لا شریک ہیں، جس طرح دو خدا کا ہونا محال ہے، ایسے ہی دو مصطفی کا ہونا محال ہے۔

سوال (۹) خدا قادر ہے کہ اس جیسا دوسرا عالم بنادے اور اُس عالم میں اِس عالم جیسی ہر چیز بنادے، پھر مثل ہونے پر اِس عالم جیسی تمام چیزیں ہونا ضروری ہیں ورنہ اِس طرح نہ ہوگا۔ لہذا اُس عالم میں حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم جیسی ہستی بھی ضرور ہوگی، ورنہ وہ عالم اِس عالم جیسا نہ ہوگا۔

جواب: رب تعالی اس عالم جیسا دوسرا عالم پیدا کرنے پر قادر ہے اور عالم ماسوی اللہ کو کہتے ہیں جو تمام ممکن ہے اور چوں کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کی نظیر ناممکن ہے، اس لیے وہ عالم سے خارج ہے۔

دوسرے یہ کہ عالم جمیع ماسوی اللہ کو کہتے ہیں، جب سارے ماسوی اللہ عالم میں داخل ہو چکے تو دوسرا عالم ناممکن ہوا، کیوں کہ اس فرضی عالم میں جو چیز اور شے مانی جائے گی وہ اِسی پہلے عالم کا جز ہوگی۔

{ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ }[البقرۃ: ۲۱،۲۲]

(اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمھیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمھیں پرہیزگاری ملے، وہ جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اُس سے کچھ پھل نکالے تمھارے کھانے کو تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھیراؤ)

تعلق: (۱) نبی کے لیے ضروری ہے کہ اپنی کتاب کا کتابِ الٰہی ہونا بیان کرے، اس کے بعد مقصد بیان کرے، چناں چہ اس جگہ بھی پہلے قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا بیان ہوا اور مقصد یہ بیان ہوا کہ یہ متقیوں کے لیے ہدایت ہے، پھر متقیوں کی پہچان کے لیے دونوں قسم کے کافروں کی نشان دہی کردی۔ اب جب بندوں کو ہدایت حاصل کرنے اور بدبختی سے بچنے کا مشتاق بنادیا تو اب حضور کی آمد کا مقصود بیان کیا، باغیوں کو وفادار بنانا، اور سب کو حق تعالیٰ کا عبادت گزار بنانا، لہٰذا ان سب آیتوں کے بعد عبادت کا ذکر ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۲]

(۲) اس سے پہلے ایمان اور کفر و نفاق کا بیان تھا اور اب عبادت کا ذکر ہے اور عبادت ایمان کے بعد ہی ہے۔

تفسیر: {یا ایُّھا النَّاسُ} ”یا“: پکارنے کا حرف ہے۔ پکارنے سے چند چیزیں مقصود ہوتی ہیں:

(۱) غافل کو اپنی طرف متوجہ کرنا، جیسے: {یا ایُّھا النَّاسُ}

(۲) اظہار محبت کے لیے۔

(۳) غائب کو حاضر کرنا۔

(۴) عتاب ظاہر کرنا۔

(۵) اظہار کرامت کے لیے، جیسے: {یا ایُّھا النبی}

(۶) اظہارِ عجز، جیسے: ”یا اللہ“۔

رب ہم کو پکارتا ہے ہماری غفلت دور کرنے کے لیے۔ اپنے نبی کو پکارتا ہے کرامت

و محبت ظاہر فرمانے کے لیے، کیوں کہ نبی ﷺ کبھی خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ آسمان وزمین کو پکارا اطاعت کرانے کے لیے، وغیرہ وغیرہ۔

ایسے ہی ہم اپنے رب کو پکارتے ہیں اپنی عاجزی کے اظہار کے لیے، کیوں کہ رب تعالی کبھی ہم سے غافل نہیں۔ غرضیکہ ایک ندا کے بہت معنی ہو سکتے ہیں۔ یہاں ندا سے غافلوں کو بیدار کرنا، غائبوں کو حاضر کرنا ہے اور عتاب کے لیے بھی ہے۔

قاعدہ: جب معرّف باللام پر "یا" لاتے ہیں تو فاصلہ کے لیے "اَیُّھا" داخل کرتے ہیں، جس سے تنبیہ کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اور چوں کہ اس میں تنبیہ ہے، اس لیے "اللّٰہ" پر نہیں آتا، "یاایّھا اللہ" اور "یاایُّھاالرحمن" نہیں کہا جائے گا۔

"النَّاس" میں سب انسانوں سے خطاب ہے، یعنی: کافر، مومن، منافق جو قیامت تک آنے والے ہیں۔

"اُعْبُدُوْا": "عبادۃ" سے بنا ہے، معنی فاتحہ میں بیان ہو چکا ہے۔

یہاں سب سے خطاب ہے۔ کافرو! ایمان لاؤ، منافقو! مومن بنو، گنہگارو! نماز پڑھو، بخیلو! زکاۃ دو، بے روزہ دارو! روزہ رکھو، مال دارو! حج کرو، کاہلو! جہاد کرو، وغیرہ۔

"رب": خدائے تعالی کا ایک نام ہے، یہی نام ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حکم مع سبب بیان ہو جائے اور عبادت کی ترغیب ہو، کیوں کہ وہ پالنے والا ہے، اس کا حق ہے۔

{اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ} میں ربوبیت کا اظہار ہے، پالنا پیدا کرنے کے بعد ہوتا ہے، رزق سے پہلے تخلیق کی بات کی ہے۔

"خَلَقَ": "خَلْق" سے ہے، معنی: نیستی سے ہستی میں لانا، جو صرف خدا ہی کا کام ہے۔ اسباب جمع کرنے کو "کسب" کہتے ہیں، بندہ کاسِب ہے، خالق نہیں، "کسب": اسباب جمع کرنا ہے، یعنی: عورت و مرد کا ملنا پیدائش کا سبب ہے، خلق نہیں۔

{وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ} میں یہ ذکر ہوا کہ وہ تمھارا بھی اور تمھارے اجداد کا بھی قدیم محسن ہے۔

''لَعَلَّ'': شک کے لیے ہے، خدا شک سے پاک ہے، لہذا تین معنی ہوسکتے ہیں:

(۱) چوں کہ عربی میں ''لَعَلَّ'' بولا جاتا ہے، اس لیے بول دیا گیا ہے۔

(۲) بندوں کی طرف سے شک کے لیے ہے، حق تعالی کی طرف سے یقین کے لیے ہے، کیوں کہ کریم اس کی امید دلاتا ہے جو یقینی ہونے والی ہو، یعنی: تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

(۳) ''لَعَلَّ'' (ترجی کا معنی) بندوں کے لحاظ سے ہے، نہ کہ رب کے لحاظ سے، یعنی: اے لوگو! رب کی عبادت اس امید پر کرو کہ شاید تقوی حاصل ہوجائے، یعنی: نہ لالچ سے کرو، نہ ناامیدی سے کرو، نہ بے خوفی سے کرو، کیوں کہ مرنے سے پہلے اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہوسکتا ہے۔

''تَتَّقُوْنَ'': ''تقوی'' سے ہے۔ یہاں تین معنی ہوسکتے ہیں:

(۱) عذاب الہی سے بچ جانا، یعنی: اے لوگو! عبادت کرو، شاید کہ تم اس کے عذاب سے بچ جاؤ۔

(۲) پرہیزگار ہوجانا، یعنی: شاید پرہیزگار بن جاؤ۔

(۳) پرہیزگاری کا نور پیدا ہوجانا، یعنی: شاید تمھارے قلب میں پرہیزگاری کا نور جلوہ گر ہوجائے۔

عبادت، تقوی کی ابتدا ہے اور تقوی اصل مقصود۔ یا عبادت راستہ ہے اور پرہیزگاری اصل منزل۔

''الذی جعل'' رب نے اپنی پہچان کرائی کہ اللہ وہ ہے کہ جس نے تم کو پیدا کیا اور یہ ایک چھپی ہوئی بات تھی، اس لیے جب انسان کو اپنا پیدا ہونا اور ابتدائی پرورش یاد نہیں تو یہ کیسے جانے کہ میرا خالق کون ہے؟ اس لیے رب تعالی نے اپنی مزید پہچان کرائی کہ تمھارا خالق

وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور زمین پر قسم قسم کے رزق پیدا فرما کر تمھاری دعوت کا سامان کیا۔

{لکم الارض} ''لکم'' سے معلوم ہوا کہ دنیا کا سارا انتظام انسانوں کے لیے ہے، جانور وغیرہ تابع ہیں۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام مسجودِ ملائکہ ہوئے، کیوں کہ آپ اصل مقصود ہیں، فرشتے تابع ہیں۔ اور جب رب تعالی کا کرم اتنا بڑا ہے کہ سب کچھ تمھارے لیے بنایا اور پھر سب چیزیں عبادت کریں اور تم شرک کرو تو کتنے افسوس کی بات ہے؟

''ارض'' کا معنی کھا جانا، یا کچل دینا، چوں کہ زمین بھی ہر چیز کو کھا جاتی ہے، یعنی گلا ڈالتی ہے اور مدتوں سے کچلی جاتی ہے اس لیے اسے ''ارض'' کہتے ہیں۔

{والسّماءَ بناء} ''سماء'' کا معنی بیان ہو چکا ہے۔ ''بناء'' سے مراد چھت، عمارت، قبہ۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمھاری خاطر زمین پر آسمان کو قبہ کی طرح بنایا، جس میں رنگ برنگ ہلکی تیز قندیلیں ہیں، یعنی: چاند، سورج تارے وغیرہ جڑ دیے۔

{وَاَنْزَلَ مِنَ السَّماءِ ماءً} اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تمھارے مکان کی چھتیں صرف سایہ دینے اور بارش سے بچنے کا کام دیتی ہیں، لیکن آسمان ایسی چھت ہے جس سے تمھارا رزق بھی اترتا ہے۔

{فَاَخْرَجَ بِہٖ} میں یہ بتایا گیا کہ پھلوں کے پیدا کرنے والے ہم ہی ہیں، بارش تو ظاہری سبب ہے۔ مقصد یہ کہ تم اپنی حقیقت معلوم کر لو، کیوں کہ زمین مثل ماں کے ہے، آسمان مثل باپ کے، اور پانی کے قطرے نطفے کی طرح اور پھل وغیرہ اولاد کی طرح ہیں، گویا تمھیں اور ان چیزوں کے پیدا کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔

{من الثمرات} میں ''من'' بیانیہ ہے، معنی: نکالا بارش کے ذریعہ ان پھلوں کو۔ یا تبعیضیہ ہے، معنی: نکالا اس بارش سے بعض پھلوں کو۔

بعض فرمانے کی تین وجہیں ہیں (۱) ہر پھل بارش سے نہیں ہوتا، بلکہ بعض بغیر بارش

کے پیدا ہوتے ہیں جیسے کھجوریں وغیرہ، بلکہ بارش سے تو بعض پھل خراب ہو جاتے ہیں۔ (۲) ہر جگہ سارے پھل پیدا نہیں ہوتے، کشمیر میں کچھ، بنگال میں کچھ۔ (۳) اس کا تعلق آئندہ عبارت سے ہے، یعنی: بارش سے بعض پھل تمھارے لیے اور بعض جانوروں کے لیے پیدا فرمائے۔

{رِزْقًا لَّكُمْ} یعنی: ہر چیز تمھارے لیے بنی ہے اگر کوئی چیز کیڑے مکوڑے، جنات وغیرہ کھالیں تو وہ سب تمھارے طفیل ہے۔

{فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا} یعنی: جب تم ساری چیز جان چکے تو رب کی بغاوت و نافرمانی نہ کرو، کسی کو اس کا ہمسر نہ مانو۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۴]

''انداد'': ''نِدٌّ'' کی جمع ہے، معنی: مثل۔ لوگ چند طرح سے شرک کرتے ہیں:

(۱) بعض خالق ہی چند مانتے ہیں، بڑی چیزوں کا ایک، اور چھوٹی چیزوں کا دوسرا۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۴]

(۲) بعض کے بقول عالَم کا بنانے والا تو ایک ہے، لیکن انتظامات ایک کے بس کا نہیں۔ [ایضًا]

(۳) بعض کے نزدیک رب ایک ہی ہے، مگر صاحبِ اولاد ہے۔ [ایضًا]

(۴) بعض کے قول میں رب ایک ہی ہے، مگر ہمارے بت اس کی بارگاہ میں دھونس کے ساتھ شفاعت کریں گے۔ [ایضًا]

(۵) بعض کے قول میں رب تو ایک ہی ہے، لیکن بعض بندے اس کی طرح قدیم ہیں اور اس سے بے پرواہیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۵]

اس مختصر جملے میں ا ن سب کی تردید فرما کر ہدایت کی گئی کہ تم کسی طرح کسی کو رب کے مثل و شریک ہر گز نہ مانو، نہ ذات میں نہ صفات میں۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۵]

{وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ} میں یہ بتایا گیا کہ تم عقلاً و نقلاً ہر طرح جان چکے کہ رب ایک ہی ہے، تو اب اگر شرک کروگے تو کوئی عذر قابلِ قبول نہ ہوگا۔ [ایضًا]

خلاصہ: اے لوگو! اپنے اسی رب کی عبادت کرو جو عبادت کے لائق ہے، اور عبادت کے لائق وہی ذات ہو سکتی ہے جو بڑی عظمتوں اور قدرتوں کا مالک ہو، نہ کہ تمھارے وہمی و خیالی معبود۔ عظمت والی ذات وہ ہے جس نے تم کو اور تمھارے داداؤں کو پیدا فرمایا، یہ عبادت بھی اسی امید پر کرو کہ تم کو حق تعالی کی طرف سے تقوی مل جائے۔ کیوں کہ آئینہ، آفتاب کے سامنے روشنی کا کام کرتا ہے، کوئلہ اور لوہا آگ میں کچھ دیر رہنے پر آگ کا کام کرتا ہے، تو تم بھی عبادت کے ذریعہ رب سے تعلق کرو تاکہ اس کی رحمتیں دست گیری کریں، کرامتیں صادر ہوں۔ [تفسیر نعیمی ۱/۲۱۵]

اس خالق کی پہچان یہ ہے کہ اس نے تمھارے آرام کے لیے زمین کے ایک ٹکڑے کو پانی سے نکالا اور پھر اس کو گارے کی طرح نرم اور لوہے کی طرح سخت نہ کیا اور نہ اس کی گولائی ایسی رکھی کہ جس پر ٹھہر نہ سکو، غرضیکہ ہر طرح اس کو تمھارے بستر کے لیے آرام دہ بنایا۔

پھر یہ کرم فرمایا کہ زمین پر آسمان کا خیمہ لگایا، جس سے کہ یہ جہان ایک گھر کی طرح ہو گیا اور تم کو اس میں رکھ کر روزانہ تین وقت تمھاری دعوت کا انتظام کیا۔ اور پانی برسا کر رنگ برنگے پھول پھل پیدا کیے، اب تم خود ہی غور کر لو کہ مال دار کم تنخواہ پر ملازم رکھے تو تم اس کی ہر طرح خدمت کرتے ہو۔ تو جس رب نے تم پر اس قدر اور اتنے احسانات فرمائے اس کو چھوڑ کر اوروں کی عبادت کرنا یا اوروں کو اس کا شریک جاننا خلافِ انسانیت ہے یا نہیں؟ [ایضًا]

فائدے: (۱) جو عبادت نہ کرے انسان نہیں۔

(۲) کافروں پر بھی عبادت فرض ہے، جس کے نہ کرنے پر عذاب ہوگا۔ سارے انسانوں سے عبادت کرنے کو کہا گیا، جیسے بے وضو پر فرض ہے وضو کرنا، نماز پڑھنا۔ ایسے ہی کافر پر فرض ہے کہ ایمان لائے اور نماز پڑھے۔ [ایضًا]

لیکن کافر پر نماز کی فرضیت شرعی نہیں، اس لیے زمانۂ کفر کی نمازوں کی قضا نہیں، بلکہ

فرض کے یہ معنی ہیں کہ دوزخ میں ایمان نہ لانے اور نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے عذاب ہوگا، چناں چہ جب دوزخیوں سے پوچھا جائے گا کہ جہنم میں کیوں گئے تو کہیں گے: {لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَ وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَ}[یعنی: ہم نمازی نہ تھے اور صدقات نہ دیتے تھے۔ سورۂ مدثر: ۴۳، ۴۴] [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۵۔۱۶]

(۳) عبادت کا فائدہ عابد کو ملتا ہے، خدائے تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کسی کی عبادت سے اس کو فائدہ ہو۔ ارشاد ہے: {لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ}[تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ سورۂ بقرہ: ۱۸۳]

(۴) باپ داداؤں پر احسان اولاد پر احسان ہے، فرمایا گیا: {وَالَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ}[اس نے تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا ہے][تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۶]

تفسیرِ صوفیانہ: چوں کہ عبادت میں تکلیف ہوتی ہے، اس لیے حق تعالیٰ نے براہِ راست پکارا، تاکہ بندے پکار کی لذت سے عبادت کی تکلیف و مشقت بھول جائیں اور سمجھیں کہ عبادت ایسی چیز ہے جس کی برکت سے ہمارے پیارے نے ہم کو پکارا ہے۔ اگر ہم جان بھی قربان کردیں تو اس پکار کی نعمت کا شکریہ نہیں ادا کرسکتے۔ اس نے پکارا، اے بھولنے والے انسانو! دنیا میں آکر تم بھول گئے، ہم تم کو نہ بھولے۔ اب بھی وقت ہے تم اپنے اس رب کی پوجا کرو۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۶]

{وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۲۳}

(اور اگر تمھیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اُتارا تو اُس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمایتیوں کو بُلا لو اگر تم سچے ہو)

تعلق: (۱) پہلے خدا کی ذات و صفات کا ذکر کیا گیا، جس سے مشرکوں کی تردید ہوگئی، اب نبوت کا ذکر ہو رہا ہے تاکہ منکرین کی تردید ہوجائے، لیکن جس طرح حق تعالیٰ

نے اپنی پہچان کرائی اپنی مخلوق کے ذریعہ، اسی طرح نبی کی پہچان کرائی کتاب کے ذریعہ۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۸]

(۲) پہلے عبادت کا ذکر ہے اور مقبول و غیر مقبول عبادت کا فرق انسانی عقل سے دور ہے، بہت سے لوگ بت پرستی کو مقبول عبادت سمجھ بیٹھے، تو ضرورت تھی کہ مقبول عبادت کا طریقہ بتایا جائے اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ کوئی دستوری کتاب بندوں کو ملے، جس کا کتابُ اللہ ہونا کھلی ہوئی دلیل سے ثابت ہو۔

(۳) پہلے بندوں کو خدا تک پہنچنے کا حکم دیا گیا اب بتایا جا رہا ہے کہ تم ادنیٰ ہو، مَیں اعلیٰ ہوں، تمھاری پہنچ ہم تک کیسے ممکن ہے، اس لیے درمیان میں واسطہ رکھا جاتا ہے، جس کا نام نبی ہے، تم وہاں پہنچو، مجھ کو پاؤ گے۔ عربوں کے مذاق کے مطابق دلیل ثابت فرمائی، یہ آیت نبوت و کتاب کے متعلق ہے۔ [تفسیر نعیمی ۱/ ۲۱۸]

تفسیر: ''اِنْ'' شک کے لیے ہے، حالاں کہ کفار کا شک یقینی تھا، لیکن اس جگہ ''اِنْ'' لانا اس طرح حکمت کے مطابق ہے کہ مخالفین میں کھڑے ہو کر ان کو مخالف کہنا بہتر نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر تم کو شک ہو تو اِن دلیلوں پر غور کرو۔

''رَیْب'' کا معنی گزر چکا، یعنی: اگر تمھیں شک ہو۔ یعنی: یہ عارضی بیماری ہے جس میں مبتلا کر دیے گئے ہو، اس عارضی بیماری کا علاج وہ ہے جو ہم بتا رہے ہیں۔

''تَنْزِیْل'' کا معنی آہستہ آہستہ اتارنا، کفارِ عرب کا اعتراض تھا کہ خدائی کتاب یک بارگی آنی چاہیے، یہ کام شاعروں کا ہے کہ دو دو شعر بنا کر دیوان تیار کرتے ہیں اور اسی طرح حضور بھی کر رہے ہیں۔ اس شک کے بارے میں کہا گیا کہ اگر شک ہے تو آنے والی دلیل پر غور کرو۔ [ایضًا]

''علی عبدنا'' میں اُن کے دوسرے شبہہ کا ذکر ہے، کہ رب کا کلام کسی بندے

خاص کر انسان اور خاص کر رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم جیسی ذات پر نہ آنا چاہیے، کہ ان کے پاس نہ مال، نہ علم۔ فرمایا گیا کہ اگر تم کو شک ہے تو آئندہ دلیل پر غور کرو۔

یہاں رب کی عطا اور حضور کا ذکر ہے اس لیے "عبدنا" فرمایا، "عبدنا" سرکار کی بڑی اور اعلیٰ صفت ہے، بندے کا کام مولیٰ سے لینا ہے۔ جہاں حضور کی عطا کا ذکر ہے وہاں رسول فرمایا، {آتاکم الرسول} یا {أغناهمُ اللهُ و رسولُه} ارشاد ہوا۔

حضور خالص بندے ہیں، کوئی نفس کا، کوئی درم کا، کوئی دینار کا بندہ ہے، حضور اللہ کے بندے ہیں۔ [ایضاً]

"سورة": "سُوْر" یا "سُؤر" سے ہے۔ یعنی: واو اصلی ہے یا ہمزہ سے بدلا ہوا ہے۔ اگر واو اصلی ہو تو معنی شہر پناہ، منزل، درجہ اور قوت ہے۔ "سورۃُ الاسد" کا معنی شیر کی قوت ہے، کیوں کہ سورت مضمون کو گھیرتی ہے، پڑھنے والا منزل طے کرتا ہے، بہ مقابلہ آیت کے سورت قوی ہوتی ہے۔

اگر ہمزہ سے بدلا ہوا ہے تو معنی: ٹکڑا ہے، کیوں کہ سورہ ٹکڑا ہوتی ہے۔ [ایضاً]

"مِنْ مِّثْلِه" میں "مِنْ" بیانیہ ہے، یعنی: ایسی سورت لاؤ جو قرآن کے مثل ہو۔ یا تبعیضیہ ہے، کفار کا قول تھا کہ اگر ہم چاہیں تو ایسا قرآن ہم بھی کہہ سکتے ہیں، فرمایا گیا کہ اگر تم ایسا قرآن کہو تو ایک سورت بارگاہِ نبوی میں پیش کرنا تاکہ تم کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔

یا "مِنْ" ابتدائیہ ہے، یعنی: ایسی سورت پیش کرو جو تمھارے بنائے ہوئے قرآن سے نکل کر آئے۔

"مثل" سے مراد ہے کہ لفظاً اور معنیً قرآن کی طرح ہو، یعنی ایسی سورت جو فصاحت وبلاغت اور غیبی خبر دینے میں قرآن کی طرح ہو۔

"مثله" کی ضمیر میں دو احتمال ہیں:

(۱) "ما" کی طرف لوٹے، یعنی: قرآن کی طرح ایک سورت لاؤ اور اس سے قرآن

کا بے مثل ہونا ثابت ہو گا۔

(۲) ''عبد'' کی طرف لوٹے، یعنی: ایسی ہستی تلاش کرو جو میرے محبوب کی طرح ہو، پھر اس سے ایک سورت بنوا کر لاؤ۔

''شھداء'': ''شھید'' کی جمع ہے، معنی: حاضر، گواہ، حاکم، مددگار۔[تفسیر نعیمی ۱/۲۲۱]

یعنی: اس کام میں بتوں کو علمائے کفر کو، فصیح و بلیغ شاعروں کو بھی مدد میں بلا لو۔

''دون'' کا معنی: پاس، قریب۔ کتاب لکھنے کو ''تدوین'' کہتے ہیں کہ اس میں مضامین ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں۔ دنیا آخرت کے قریب ہے۔ پھر بطورِ مجاز کم رتبہ پر بولا جانے لگا، پھر اس کے بعد حد سے بڑھنے کو بھی ''دون'' کہا جانے لگا۔ معنی یہ ہے کہ اے کافرو! تم خدا کو چھوڑ کر جس کسی کو اپنا معبود یا مددگار سمجھ بیٹھے ہو اُن سب کو جمع کر لو تا کہ وہ تمھارے اس کام میں مدد کریں۔

{اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ} اس کا مطلب یہ نہیں کہ کفار کے سچے ہونے کا احتمال ہے، بلکہ چیلنج کے موقع پر اس طرح سے بولا جاتا ہے کہ اگر تم میں کوئی بل بوتہ ہے تو مقابلہ میں آجاؤ۔ [ایضاً]

خلاصہ: کفارِ عرب چند قسم کی بدگمانیاں رکھتے تھے کہ رسول اللہ یہ کلام بنا کر رب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، اس آیت میں آسمانی اور انسانی کتاب کی پہچان بتائی گئی۔ ریل انجن، گیس لائٹ وغیرہ انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور چیونٹی، جگنو وغیرہ خدا کے بنائے ہیں، حالاں کہ دونوں کی رفتار اور روشنی میں بڑا فرق ہے، پتہ چلا کہ جس کی طرح انسان بنا لے وہ انسان کی محنت ہے اور جو نہ بن سکے وہ خدا کی طرف سے ہے۔

یعنی: اگر تم کو شک ہے تو اور معجزات کا کیا؟ صرف قرآن کا مقابلہ کر لو۔ کیوں کہ وہ بھی تمھاری طرح عرب کے ہیں، حلیمہ کے گاؤں میں ابتدائی پرورش ہوئی، پھر شروع سے ہی

گوشہ نشینی میں مشغول رہے، نہ علما کی صحبت، نہ فصحا و بلغا کی مجلسیں دیکھیں۔ تو تم کو اذن عام دیا جاتا ہے کہ وہ تنہا قرآن پڑھتے ہیں تم سارے عرب اکٹھے ہو کر ایک چھوٹی سی سورت بنا کر لے آؤ جو قرآن کے مثل ہو۔ اگر ایک سورت بن جائے تو خدا کی کتاب نہیں اور اگر نہ بن سکے تو خدا کی کتاب ہے، انجن اور چیونٹی والی مثال گزر چکی ہے۔ [ایضاً ملخصاً]

قرآن کی چند خوبیاں:

(۱) شاعر کا اعلیٰ کلام وہ ہوتا تھا جو جھوٹ اور مبالغہ سے بھرا ہو، سچی سیدھی باتیں معمولی معلوم ہوتیں ۔ لیکن قرآن جھوٹ اور مبالغہ سے بالکل پاک ہے، پھر بھی وہ کشش کہ سننے والے تڑپ جاتے ہیں، سچی اور سیدھی بات کہتا ہے، مگر تڑپا دیتا ہے۔ [ایضاً]

(۲) دیکھی ہوئی چیز کی خوبیاں بیان ہو سکتی ہیں، شعرا، معشوق، شراب، گھوڑا، بادشاہ وغیرہ دیکھی ہوئی چیزوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مگر بے دیکھی ہوئی چیز کی تعریف کر کے اس کے اوصاف دلوں میں اتار دینا قرآن کی خصوصیت ہے۔ اُس نے قیامت، جنت، دوزخ وغیرہ بیان کر کے اُن کو منوا لیا۔

(۳) بڑے بڑے شعرا اور قادر الکلام لوگوں کے کلام میں دو چند شعر ہی اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں، لیکن قرآن از اول تا آخر، اعلیٰ سے اعلیٰ، بلند و بالا ہے کہ مخلوق عاجز ہے۔

(۴) عمدہ کلام ایک یا دو بار پڑھنے کے بعد پھیکا ہو جاتا ہے، لذت جاتی رہتی ہے، لیکن قرآن، ایک مضمون کو کئی بار بیان کرے تو نیا ہی لطف ملتا ہے۔

(۵) بڑے بڑے خطیب و شعرا کہتے ہیں کہ عشقیہ مضامین سے وجد پیدا ہوتا ہے، حال آتا ہے۔ لیکن حرام و حلال خشک مضامین ہیں، اُن کے بیان سے کیفیت نہیں پیدا ہوتی، لیکن قرآن انھیں بیان کرے تو وجد آتا ہے۔

(۶) اچھے سے اچھا کلام، ہر موقع پر لطف نہیں دیتا، خوشی کے موقع پر مرثیہ، اور غم

کے موقع پر خوش کن اشعار نہیں پڑھے جاتے، لیکن قرآن ہر غمی و خوشی، آرام و مصیبت ہر موقع پر اس کی تلاوت سے دلوں کو سکون و سرور ملتا ہے۔

(۷) قرآن سارے علموں کی اصل ہے، علم الکلام، علم الفقہ، علم اصول، علم نحو، علم لغت، علم زہد، غیب کی خبریں، علم الاخلاق، غرضیکہ ہر چیز کا مکمل بیان ہے، لیکن کوئی کتاب صرف ایک ہی فن یا مضمون کو متحمل ہوتی ہے۔

(۸) اعلیٰ کلام چند بار پڑھنے سے پُرانا ہو جاتا ہے، لیکن قرآن پڑھتے جاؤ، لطف بڑھتا جائے گا۔

(۹) بہتر سے بہتر دعا ایک یا دو خصوصیت رکھتی ہے، قرآن ہر جسمانی و روحانی بیماری اور مصیبتوں کا علاج ہے۔ عبارت تعویذ۔ دم بیماریوں سے شفا۔ عمل میں دونوں جہان کی سرخروئی اور بھلائیاں ہیں۔

(۱۰) سارے علوم اس کے خادم اور یہ قرآن سب کا اصلی مقصود ہے، نحو، صرف، منطق، فلسفہ اور حکمت وغیرہ پڑھنا اسی کے لیے ہوتا ہے۔ پھر اس کے سکھانے کے ابتدائی استاذ، درمیانی استاذ اور بڑے استاذ ہیں، پھر بھی کوئی دعوی نہیں کرسکتا کہ سب سمجھ لیا اس لیے سب عاجز ہیں۔ [تفسیر نعیمی ۱/۲۲۱۔۲۲]

صوفیانہ: معترضین کے اعتراضات دل کے پردے ہیں، جس کی وجہ سے وہ کمالِ قرآن اور جمالِ صاحبِ قرآن نہ دیکھ سکے، معترضین اغیار ہیں اور اغیار نہ جمالِ یار کے قابل ہوتے ہیں نہ اسرار کے۔

ہر ایک کا حصہ نہیں دیدار کسی کا
بوجہل کو محبوب دِکھائے نہیں جاتے

فرمایا گیا اے بوجہل آنکھ والو! تم اگر مگر کے چکر میں ہو، اس بھنور سے نکلو، قرآن اور

قرآن والے مصطفی کو صرف بصارت سے نہیں، بصیرت سے دیکھو تو تم پر ان کے اسرار ظاہر ہو جائیں گے۔ [ایضًا]

قرآنی دلائل، علماو صوفیہ کی صحبتیں، اُن پردوں کو پھاڑنے والی قینچیاں ہیں کہ عالم اصل حقیقت بتاکر اور صوفیہ دکھاکر ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں۔

{فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝۲۴} [البقرۃ ۲۴]

پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہے کافروں کے لیے۔

تعلق: پہلے چیلنج تھا اب مقصود یہ ہے کہ تم اپنی مجبوری معلوم کر کے قرآن پر ایمان لے آو۔

تفسیر: ''اِنْ'' شک کے لیے ہوتا ہے، یہاں مخاطبین کے اعتبار سے فرمایا گیا کہ اے کافرو! اگر تم یہ کام نہ کر سکو۔

''لم تفعلوا'' ماضی کے معنی میں ہے، مگر ''اِنْ'' کی وجہ سے مستقبل کا معنی ہے، یعنی: کفار کی کوشش سے پہلے کہا گیا کہ کوشش کر دیکھو، نہ کر سکو تو ایمان لانا۔

''وَلَنْ تَفْعَلُوا'' میں غیب کی خبر ہے، یعنی: ہرگز نہیں کر سکو گے، الحمدللہ یہ خبر سچی ہوئی۔ کفار کے دلوں میں آگ بھڑک اٹھی، بہت کچھ مقابلے کی کوشش کی، لیکن آج تک نہ کر سکے، ورنہ اشاعت کرتے۔

ترے آگے یوں ہیں دبے لچے فصحا عرب کے بڑے بڑے
کوئی بولے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

''فاتَّقُوْا'': ''وَقْیٌ'' سے ہے، معنی: ڈرنا، بچنا، مطلب ہے کہ ان اعمال سے بچو

جو جہنم کا ذریعہ بنیں۔

{النار التی} جہنم میں ٹھنڈے طبقے بھی ہیں اور آگ کا طبقہ بھی ہے، لیکن صرف آگ کا تذکرہ ہوا کیوں کہ آگ اصل ہے باقی سب تابع ہے۔

''التی'' سے معلوم ہوا کہ جہنم کی ہر آگ کا ایندھن آدمی پتھر نہیں، بلکہ اس آگ کا جو کافروں کے لیے ہے۔ جس طبقہ میں جنات کافر رہیں گے اس کا ایندھن جن ہیں، جس طبقے میں کچھ روز کے لیے گنہ گار مسلمان رہیں گے اس کا ایندھن بداعمال ہوں گے، نہ کہ وہ خود۔

''وَقُوْد'' کا لفظی معنی روشن کرنا، بھڑکانا۔ یہاں مراد روشن کرنے کا آلہ یعنی ایندھن ہے۔ ''الناس'' سے مراد کفار ہیں۔

''الحجارۃ'' میں تین قول ہیں:

(۱) بعض کے نزدیک گندھک مراد ہے، کیوں کہ اس کی آگ بہت تیز ہوتی ہے، دیر میں بجھتی ہے اور اس میں گرمی کے ساتھ سخت بدبو ہوتی ہے۔

(۲) اس سے مراد بت ہیں، کیوں کہ کفار اُن کو خدا مانتے تھے، وہاں کفار کی ذلت کے لیے یہ بھی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

(۳) بعض کے نزدیک عام پتھر مراد ہیں۔ معنی ہے کہ دنیاوی آگ، پتھر سے بجھ جاتی ہے، لیکن وہ ایسی آگ ہے جو پتھر سے اور بھڑکتی ہے۔ لیکن اس سے سنگ اسود، مقامِ ابراہیم، صفا و مروہ کے پتھر، منبر و روضۂ مطہرہ کے درمیانی جگہ کے پتھر علاحدہ ہیں، یہ چیزیں جنتی ہیں۔ جس طرح حضور علیہ السلام کا استنِ حنانہ و ناقہ شریف و حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی وغیرہ جنتی ہیں۔

''اُعِدَّت'' سے معلوم ہوا کہ وہ آگ کافروں کے لیے بنی ہے، پتھروں وغیرہ کا اس میں جانا اُن کافروں کے طفیل ہے، اسی طرح گنہ گار مسلمان بھی دوزخ میں جائیں گے، لیکن کافروں کے تابع ہو کر، جیسے لوہار کی بھٹی ٹیڑھے لوہے کو سیدھا کرنے کے لیے بنی ہے، لیکن

اس میں کوئلے بھی جلتے ہیں اور کبھی لوہے بھی صاف کرنے کے لیے ڈالے جاتے ہیں۔[تفسیر نعیمی، ۲۲۳۔۲۴]

خلاصہ: جب کفار کو قرآن کے مقابلے کا اعلان دیا جا چکا تو بتایا گیا کہ اگر مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکو اور ہم تم سے کہہ دیتے ہیں کہ کامیاب نہ ہو سکو گے تو سمجھ لینا کہ اس کا انکار حقیقت میں خدائے واحد کا مقابلہ کرنا ہے اور اس کا مقابلہ کرنا جہنم میں ٹھکانا بنانا ہے۔ جہنم کی تیزی کا یہ حال ہے کہ دوسری آگ تو پتلی اور باریک لکڑیوں سے سلگتی ہے، لیکن وہ پتھروں اور آدمیو ں سے سلگتی ہے۔ یا دوسری آگ میں لکڑیاں جلتی ہیں اور اس میں آدمی اور پتھر جلتے ہیں۔ لہٰذا تم کو لازم ہے کہ آگ سے بچنے کے لیے کوئی سامان کرو، یعنی اس قرآن پر ایمان لاؤ اور اس کو اپنا دستور العمل بناؤ۔

فائدہ: قرآن معجزہ ہے، سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزے باقی نہ رہے، لیکن ہمارے نبی علیہ السلام کا یہ معجزہ یعنی قرآن شریف ابھی تک باقی ہے۔[تفسیر نعیمی ۲۲۴]

تفسیر ایوبی شیخ طریقت، مصلح قوم وملت حضرت مولانا محمد ایوب شریف القادری علیہ الرحمہ (ولادت: ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء، وفات: ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء) کی تحریری کاوشوں میں سے ایک ہے۔ یہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی چوبیس آیتوں کی تفسیر پر مشتمل ہے، زبان عام فہم ہے، اس لیے کم خواندہ حضرات کے لیے بھی قابل استفادہ ہے، حضرت چوں کہ تبلیغی اور دعوتی مزاج رکھتے تھے اس لیے آسان عبارت میں تحریر پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

مؤلف کے صاحب زادے اور جانشین عالی مرتبت شاہ سبطین رضا قادری ایوبی نے ان کے قلمی ذخیرے سے یہ تفسیری اوراق پارینہ نکال کر حضرت مولانا محمد نظام الدین قادری مصباحی اور حضرت مولانا کمال احمد علیمی اساتذۂ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی کے حوالے کیا، ان حضرات نے بڑی ہی ذمے داری کے ساتھ مسودے پر نظر اصلاح ڈالی، اب یہ تفسیری جواہر پارے آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔

سبب تالیف تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن لگتا ہے کہ حضرت مؤلف علیہ الرحمہ اپنے مریدین اور عام اردو خواں قارئین کے لیے آسان زبان میں تفسیر کی کوئی کتاب لکھنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مشفق اور کریم استاذ حضرت مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ کی کتاب "تفسیر نعیمی" کی تلخیص و تسہیل شروع کی، لیکن تبلیغی مصروفیات نے اس کام کو ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ پھر ایک طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

اللہ رب العزت ان کے درجات بلند فرمائے اور اس کتاب کو ذریعہ مغفرت بنائے۔ آمین بجاہ النبي الأمي محمد المصطفى عليه التحية والثناء.

اختر حسین فیضی
استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

۲۶/۹/۱۴۴۲ھ/ ۹/۲/۲۰۲۱ء
شب چہار شنبہ

Published:

Majlis-e-Ayyubi

Piprakanak, Kushinagar, UP. 274401